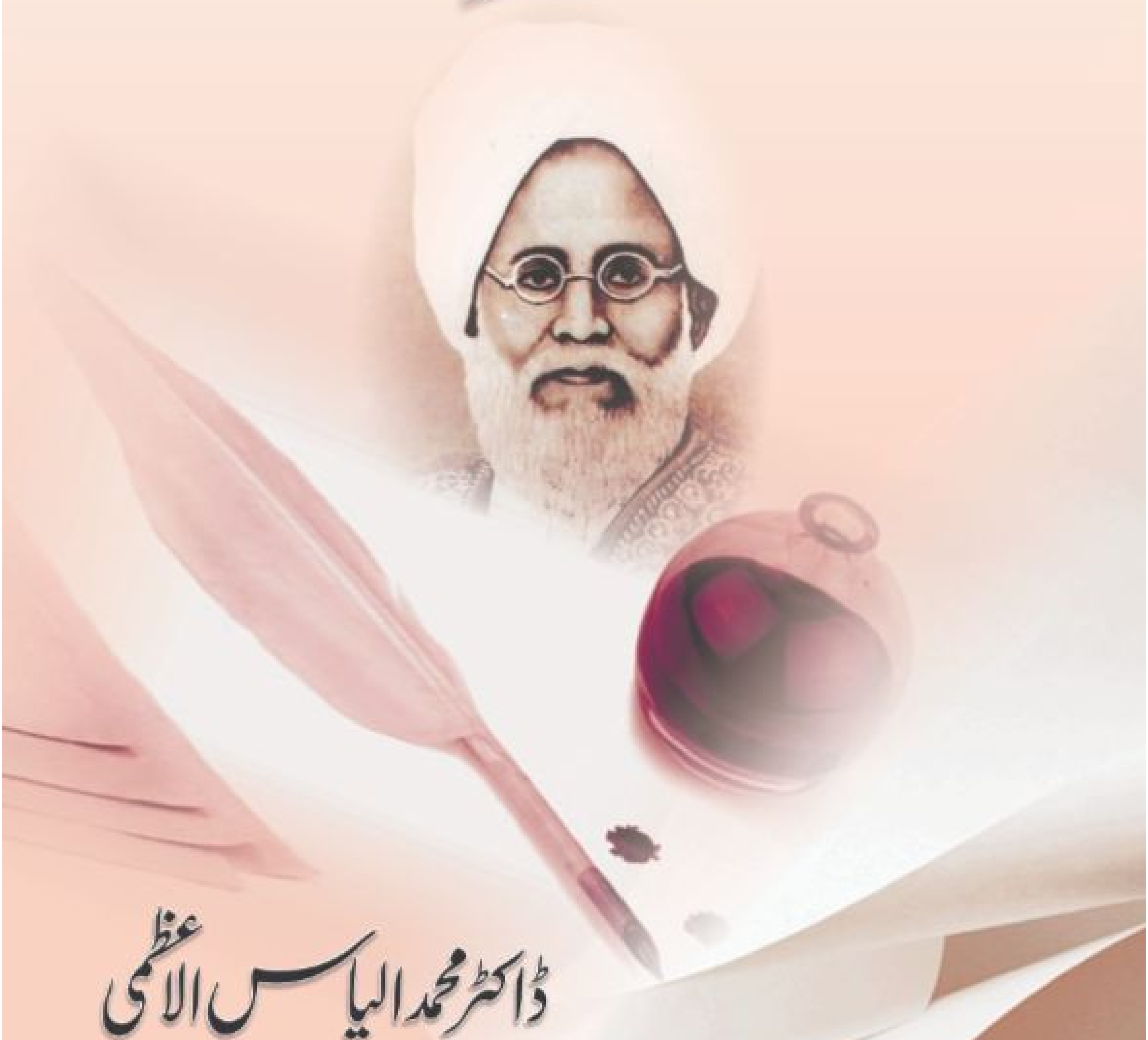
بیانِ شبلی (۳)



ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

○

بیان شبلی

(۳)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

○○○

بسم الله الرحمن الرحيم

بیان شبلی

(۳)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

BAYAN-E-SHIBLI-3

by: Dr. Mohammad Ilyas Azmi
azmi408@gmail.com
+919838573645

Year of Edition Nov. 2023
Rs: 350/-
ISBN:

کتاب	:	بیان شبلی۔۳
ناشر ومولف	:	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
باراول	:	جنوری:۲۰۲۳ء
قیمت	:	۳۵۰؍روپئے
صفحات	:	۲۲۴
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶
ملنے کا پتہ	:	دارالمصنّفین اعظم گڑھ

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
H.o. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)
B.o. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 45678203, 45678286, 23216162
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

○

انتساب

عزیز دوست

محمد عارف خاں

شریک مرتب: ہماری زبان۔ دہلی

کی نذر

○○○

○

تصانیف شبلی کی مقبولیت

کے اسباب

ازـ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

علامہ شبلی نعمانی کی تصانیف میں جو مابہ الامتیاز اور سرمایہ ناز ہے وہ یہ ہے کہ وہ اسی فن پر قلم اٹھاتے ہیں جس کا ذوق ان کے ضمیر میں بلکہ خمیر میں ہے۔ اور جب اس فن پر قلم اٹھانا چاہتے ہیں تو اول اس کا مطالعہ (اسٹڈی) کاہش وکاوش کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کا ذوق سلیم یہ رہنمائی کرتا ہے کہ کس ماخذ کو قبول کریں اور کس کو رد؟ کس بات کو مانیں، کس کو نہ مانیں؟ جب اس طرح وہ کل مالہ و ماعلیہ پر قادر ہو جاتے ہیں تو پھر یہ دیکھتے ہیں کہ کیا کہیں اور کیا نہ کہیں؟ جو قابل کہنے کے ہے اس کو اپنے خاص اسلوب میں جس کی صفائی میں زور چمکتا ہے ادا کر دیتے ہیں۔ یہی اسباب ہیں جن کے اثر سے ان کی تصانیف مقبول ہو رہی ہیں۔ خیالوں میں انقلاب پیدا کر رہی ہیں۔ باوجود گراں قیمت ہونے کے، گراں قدر ہونے کے سبب بار بار چھپتی ہیں اور بکتی ہیں۔''

○○○

ترتیب

•••

دیباچہ

سلسلہ ''بیان شبلی'' کا تیسرا حصہ آپ کی نذر ہے۔ بحمد للہ اس سلسلہ نے خاصی شہرت و مقبولیت پائی۔ بڑی بات یہ ہے کہ اہل علم وکمال اور قدر دانان شبلی کے ساتھ عام قارئین نے بھی اس کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا اور سراہا۔ بلا شبہ ان مطالعات سے علامہ شبلی کی کتاب زندگی کے متعدد نئے پہلو اور نئے گوشے سامنے آئے ہیں۔ امید ہے یہ سلسلہ ابھی اور دراز ہوگا اور ابھی شبلیات کے مزید گوشے روشن ہوں گے۔

اس حصہ میں نو مقالات شامل ہیں۔ اس کا آغاز ''نوادرات شبلی'' سے ہوا ہے جس میں علامہ شبلی کی تین اہم نو دریافت تحریریں جس میں ایک سیرت نبویؐ کی تالیف سے متعلق ہے اور دوسری مولانا حالی (۱۸۳۶-۱۹۱۴ء) کی ''حیات سعدی'' کے بارہ میں ہے، جبکہ تیسری تحریر محمد عبدالقوی فانی سابق استاد شعبہ اردو لکھنو یونیورسٹی کے لئے ایک سفارشی تحریر ہے، جو ان کی مالی معاونت کے لئے نظام حیدرآباد کو لکھی گئی تھی۔ ان کے علاوہ قاضی عبدالرحمٰن حیرت کے نام ایک نایاب خط، دو نادر خطبے اور دو فارسی غزلیں جو کلیات شبلی میں شامل نہیں ہیں اس حصہ میں شامل کی گئی ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کی غیر مطبوعہ اور غیر مدون تحریروں کی دریافت کا سلسلہ ایک صدی بعد ہنوز قائم ہے۔ مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے کہ ناچیز کی ذرا سی محنت اور تلاش وتفحص سے مطالعہ شبلی کے بڑے بیش قیمت نوادر یکجا ہوتے جا رہے ہیں۔ راقم اب تک ان نوادرات کے پانچ مجموعے مراسلات شبلی، نوادرات شبلی، مکتوبات شبلی، خطبات شبلی اور افادات شبلی قدر دانان شبلی کی خدمت میں پیش کر چکا ہے۔ بیان شبلی کے تینوں حصوں میں شامل نوادرات ان کے علاوہ ہیں۔

دوسرے مقالہ ''بیان شبلی''میں علامہ شبلی سے متعلق چند قدیم وجدید معلومات بالخصوص کتابوں اور رسالوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیز تصانیف شبلی کے بعض انتخابات کا بھی تعارف کرایا گیا ہے۔

علامہ شبلی کی علمی زندگی کا آغاز مناظروں اور مناظراتی تحریروں سے ہوا تھا اور انھوں نے اس سلسلہ میں متعدد رسائل لکھے تھے جن میں بقول مولانا سید سلیمان ندوی بعض ان کے نام سے چھپے اور بعض دوسروں کے نام سے۔ ان میں **اسکات المعتدی علی انصات المقتدی** اور **ظل الغمام فی مسئلة القراة خلف الامام** کے سوا کوئی اور رسالہ غالبًا محفوظ نہیں رہا۔ ان رسائل کے جوابات کے لئے متعدد علما اور اہل قلم میدان میں آئے اور جوابی رسالے لکھے گئے۔ علامہ شبلی نے اگرچہ اس ناپسندیدہ میدان سے جلد ہی خود کو کنارہ کر لیا مگر یہ ناپسندیدہ سلسلہ ایسا قائم ہوا کہ ایک صدی تک جاری رہا بلکہ اب تک قائم ہے۔ اس سلسلہ کی آخری کتاب ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی [۱۹۵۳-۲۰۲۰ء] کے قلم سے ''مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار'' ۲۰۰۵ء میں علی گڑھ اور دارالنوادر لاہور سے منظر عام پر آئی۔ اس سلسلہ کی طوالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی کی تقریباً تمام کتابوں کے رد یا جوابات لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب میں بڑی تلاش وجستجو سے ان کی تفصیلات یکجا کی گئی ہیں اور توضیحی اشاریہ کی صورت میں انہیں پیش کیا گیا ہے۔ یہ اشاریہ اس غرض سے تیار کیا گیا ہے اور شائع کیا جا رہا ہے کہ یہ ایک اسکالر کے لئے بالخصوص مطالعہ شبلی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک اہم موضوع مطالعہ تحقیق وتدقیق وتصنیف ہو سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان جوابی مناظراتی اور محاکماتی کتابوں کا محققانہ اور منصفانہ جائزہ لیا جائے اور دکھایا جائے کہ ان کا علمی پایہ کیا ہے۔؟

تصانیف شبلی کے رد میں لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد ۲۷ر ہے۔ علامہ شبلی کی ایک کتاب کے جواب میں چار اور پانچ کتابوں تک کا لکھا جانا حیرت انگیز بات ہے۔ اس نازیبا روش میں بھی انفرادیت کا تاج علامہ شبلی ہی کے سر ہے۔ ہماری تصنیفی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا مصنف گذرا ہوگا جس کی کتاب کی اشاعت سے پہلے اس پر اس قدر زور ڈالا گیا ہو کہ وہ اپنی کتاب نہ لکھے یا نہ لکھ سکے۔ اس مقالے سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ تصانیف شبلی کے جوابات کس

معیار کے ہیں؟اوران کا تحقیقی پایہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔؟ اور ان کا اسلوب نگارش کیسا ہے۔؟ یہاں اس سلسلہ کا ایک واقعہ نقل کرنا شاید نامناسب نہ ہو کہ ''سیرۃ النعمان'' کے جواب میں ممتاز اہل حدیث عالم مولانا محمد عبدالعزیز محمدی رحیم آبادی نے ''حسن البیان فی مافی سیرۃ النعمان''، لکھی ہے۔اس کے بارہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' میں یہ لطیفہ لکھا ہے کہ

> ''سیرۃ النعمان کے جواب میں مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی نے ''حسن البیان'' نام کتاب لکھی تھی، اس میں غلط فہمی کی بنا پر مولانا (شبلی) پر انگریزی لباس پہننے کا الزام لگایا تھا۔مولانا فرماتے تھے کہ ''اتفاق سے ایک جگہ میری ان کی ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ میں انگریزی لباس تو کبھی نہیں پہنا۔مولانا رحیم آبادی نے پشیمانی ظاہر کی اور فرمایا کہ میں نے یوں ہی سنا تھا۔'' (حیات شبلی، ص:۷۳۸)

اسی طرح ردالموازنہ اور تردید الموازنہ وغیرہ کے ناموزوں مشمولات اوران کی زبان اوراسلوب نگارش اس لائق نہیں کہ انہیں پڑھا بھی جا سکے۔باوجودان سب امور کے یہ ایک اہم موضوع تحقیق وتدقیق ہے اوراس پر تحقیقی مقالہ ضرور لکھا جانا چاہئے۔ڈاکٹر نیر مسعود نے ''موازنہ کے دوجواب'' کے عنوان سے فکر ونظر علی گڑھ شبلی نمبر (جون ۱۹۹۶ء) میں جو مقالہ لکھا ہے وہ تعارفی ہے۔اس سے موضوع کا حق کما حقہ ادا نہیں ہوتا۔

گذشتہ دنوں ناچیز کی ایک کتاب ''اثرات شبلی'' دوجلدوں میں شائع ہوئی، جس میں عہد شبلی سے عصر رواں تک کے متاثرین اور مادحین شبلی کا مطالعہ وتجزیہ شامل ہے۔اس کتاب کی اشاعت کے بعد دریافت ہونے والے چند تاثرات کوایک اور مقالہ میں یکجا کرکے اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔اس میں بھی چند بڑی اہم شخصیات کے خیالات وتاثرات آگئے ہیں۔بالخصوص مشفق خواجہ کی ایک دلچسپ تحریر شامل ہے۔اس سلسلہ کا ایک مفصل مضمون ''ایک عاشق شبلی قاضی عبدالرحمٰن حیرتؔ'' بھی کتاب کی زینت ہے۔علاوہ ازیں تحریک ندوہ کے ابتدا میں علامہ شبلی کے سوااعظم گڑھ کے جن اشخاص اور بزرگوں نے حصہ لیا ایک مقالہ میں پہلی بار ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

علامہ شبلی کی سیرت وشخصیت اور متعلقات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر خانوادۂ شبلی پر اب تک سرے سے کوئی مقالہ نہیں لکھا گیا تھا۔ ناچیز نے اس کمی کی تلافی کے لئے اولاً علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل (م: ۱۲نومبر ۱۹۰۰ء) کی شخصیت پر ایک مفصل مقالہ لکھا جو ناچیز کی کتاب ''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' میں بطور ضمیمہ شامل ہے۔ اب ان کے صاحبزادگان محمد مہدی حسن بیرسٹر، محمد اسحاق وکیل اور محمد جنید سب جج کان پور کی شخصیت پر ''برادران شبلی'' کے عنوان سے ایک مفصل مقالہ لکھ کر شامل کیا گیا ہے۔

دارالمصنّفین جو دراصل ''شبلی منزل'' ہے، شبلی وسلیمان اور دوسرے ارباب قلم کی تحقیقی خدمات کے سبب ادبا وشعرا کی توجہ کا خاص مرکز رہا ہے۔ ''مسافران شبلی منزل'' کا پہلی بار ایک مقالہ میں احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دارالمصنّفین کی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب ہے۔ اس سے مختلف حلقوں میں دارالمصنّفین کی عظمت ومقبولیت کا ایک منظر نامہ سامنے آتا ہے۔ اس میں شذرات معارف اور بعض دوسری کتب کے حوالہ سے ''شبلی منزل'' آنے اور قیام واستفادہ کرنے والوں کی ایک اجمالی تاریخ سامنے آتی ہے۔ اس کو خاص طور پر اس لئے موضوع بنایا گیا ہے کہ اب شبلی منزل اور اس کی ایک ایک چیز کی حیثیت تاریخی اور دستاویزی ہے۔ اور بعض اہل علم نے بجا طور پر اسے ہندوستان کا بیت الحکمت قرار دیا ہے۔

مسافران شبلی منزل میں علامہ شبلی کے دوست نواب محسن الملک سے شاگرد مولانا محمد علی جوہر تک، نامور عالم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ سے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ تک اور پنڈت موتی لال نہرو اور راشٹر پتا مہاتما گاندھی سے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو تک ہر طبقہ اور ہر حلقہ کے ارباب کمال جس محبت اور والہانہ انداز میں دارالمصنّفین آئے اور اپنی عقیدت شبلی کا اظہار کیا وہ حیات شبلی اور تاریخ دارالمصنّفین کا ایک انتہائی اہم باب ہے۔ اسے روشنی میں لانا بہر صورت ضروری تھا۔ البتہ یہ مقالہ محض عہد شبلی وسلیمان کے مسافروں کے ذکر تک محدود ہے۔

اردو وفارسی کے جن شعرا نے علامہ شبلی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے ایک مقالہ میں ان کا اور ان کی تخلیقات کا ذکر ہے۔ یہ دراصل ناچیز کی کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' کے

چنداضافات ہیں۔اس طرح ''بیان شبلی'' کا یہ تیسرا حصہ بھی متنوع معلومات اور گونا گوں نوادرات وآثار سے آراستہ ہے۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بھی حسن قبول کی دولت سے سرفراز کرے۔

کم علمی، نامساعد حالات اور خراب صحت کے باوجود مطالعہ شبلی کے جس سلسلہ کا ناچیز نے عزم کیا تھا اللہ کے فضل وکرم سے اسے بڑی مقبولیت بلکہ محبوبیت نصیب ہوئی۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''بیان شبلی'' کا یہ حصہ اس سلسلہ کی تیسویں جلد ہے۔اس بڑی کامیابی پر میں اپنے پروردگار کا بے پایاں اور سراپا شکر وسپاس گذار ہوں کہ اس کی مرضی کے بغیر کچھ وقوع پذیر نہیں ہوتا۔میں اپنے احباب اور متعلقین کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے ہر موقع پر حق تعلق نبھایا۔برادرم مولانا عرفات اعجاز اعظمی مدیر ماہنامہ نوائے حرم گورکھپور اور برادرم مولانا مفتی شرف الدین الاعظمی مدیر ماہنامہ الماس ممبئ خاص دعا وشکریہ کے مستحق ہیں کہ یہ محبت، تعلق اور دل جوئی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور ہر تعاون کے لئے تیار رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ انہیں دین ودنیا میں سرخ رو کرے۔

بچوں میں محمد علی عادل اور حبیبہ الیاس نے اس حصہ کی تکمیل میں زیادہ حصہ لیا ہے۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا مستقبل روشن کرے۔

ناچیز
محمد الیاس الاعظمی
ادبی دائرہ،اعظم گڑھ

۲۶/اکتوبر۲۰۲۲ء

[۱]

نوادرات شبلی

جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے علامہ شبلی کی تحریروں کی جمع وتدوین واشاعت کا کام بڑے پیمانہ پرانجام دیا اور گیارہ جلدوں میں ان کے مقالات اور خطوط و خطبات شائع کئے۔ تقریباً ایک صدی بعد یہ کام ناچیز نے شروع کیا اور اب تک مکتوبات شبلی، مراسلات شبلی، خطبات شبلی ،نوادرات شبلی اورافادات شبلی پانچ جلدیں شائع کر چکا ہے۔ علاوہ ازیں بیان شبلی کی دونوں جلدوں میں متعدد نادر تحریریں شامل ہیں۔ باوجوداس کے یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ گذشتہ دنوں متعدد نادر تحریریں دستیاب ہوئیں، چونکہ یہ تحریریں مطالعہ شبلی میں اہم رول ادا کرسکتی ہیں اس لئے قدر دانان شبلی کے نذر کی جاتی ہیں۔

تین نادر تحریریں

علامہ شبلی نے تالیف سیرت سے پہلے اس کی اہمیت اور ضرورت سے متعلق دو تحریریں لکھی تھیں۔ پہلی تحریر انہوں نے ماہنامہ الندوہ میں جنوری ۱۹۱۲ء میں جس کے وہ خود مدیر تھے شائع کی ،جبکہ دوسری تحریر ان کے شاگرد مولانا ظفر علی خاں کے اخبار روزنامہ زمیندار لاہور کے ’’پیمبر نمبر‘‘ [یکم مارچ ۱۹۱۲ء] میں شائع ہوئی۔ الہلال کی تحریر مولانا سید سلیمان ندوی نے مقالات شبلی جلد ہشتم میں شامل کی ہے، جبکہ زمیندار میں شائع تحریر شامل ہونے سے رہ گئی۔ حال میں ہمارے کرم فرما ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب نے اپنی گراں قدر تصنیف ’’دو کوزہ گر شبلی نعمانی اور ظفر علی خاں‘‘ بھیجی تو اس سے علامہ شبلی کی یہ نادر تحریر ہاتھ آگئی۔ جو درج ذیل ہے:

ا۔ایک مبسوط اور مستند سیرت نبویؐ کی ضرورت

میں اس بات سے ناواقف نہیں کہ آج کل مسلمانوں کی مذہبی اور قومی ضرورتوں کی فہرست میں سیرت نبویؐ کا عنوان سب سے بالاتر ہے۔ مجھ کو اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ ملک نے مجھ کو پرائیویٹ طور پر اور اخبارات کے ذریعہ سے بارہا اس ضرورت کی یاددلائی ہے۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میں کسی حد تک اس کام کو انجام دے سکتا ہوں لیکن مجھ کو یہ بات ظاہر کر دینی ضروری ہے کہ لوگ سیرت نبویؐ کی مشکلات کا اندازہ نہیں کرتے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عربی زبان میں آنحضرت ﷺ کی بہت سی سوانح عمریاں اور عام تاریخیں موجود ہیں ان کو بہ آسانی اردو زبان میں منتقل کر دیا جا سکتا ہے۔ صرف اس بات کی ضرورت ہوگی کہ واقعات کی ترتیب اور استنباط نتائج میں مذاق حال کا لحاظ رکھا جائے۔

اس غلطی کو میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ دکھانا چاہتا ہوں جس سے مقصود ہے کہ یا تو قوم اپنی ذمہ داریوں کا بین احساس کرلے گی اور اس کا سامان کرے گی یا میں اس الزام سے بچ جاؤں گا کہ اس قدر اہم اور ضروری کام چھوڑ کر میں شعرالعجم وغیرہ تفریحی کاموں میں اوقات ضائع کر رہا ہوں۔ مشکلات حسب ذیل ہیں:

ا۔ آنحضرت کے حالات، سلاطین اور امرا کے حالات کی طرح تاریخ نویسی کے عام مذاق کے موافق نہیں لکھے جاسکتے۔ ہم مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ آنحضرت کے متعلق ایک واقعہ بھی صحت کے اعلی معیار سے ذرا بھی گر جائے تو سخت جرم ہے۔ اس لیے نہایت تحقیق، تنقید، حزم واحتیاط سے کام لینا ہے۔ عربی میں جو تاریخیں نہایت مستند خیال کی جاتی ہیں مثلاً کامل ابن الاثیر، ابن خلدون، ابوالفداء وغیرہ یہ خود مستقبل کتابیں نہیں ہیں بلکہ ۳۰۲ھ تک کے واقعات کے لحاظ سے یہ سب کی سب تاریخ طبری سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے واقعات کی صحت کی جب بحث پیش آئے تو ان کتابوں کے معتبر اور نامعتبر ہونے کی حیثیت بالکل بیکار ہو جاتی ہے بلکہ یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ان کی ماخذ یعنی تاریخ طبری کی کیا حالت ہے۔ طبری اپنی ذات سے نہایت ثقہ شخص ہے، لیکن

ظاہر ہے کہ وہ خود عہد نبوت میں موجود نہ تھا اس لیے اس نے تمام واقعات، راویوں کے ذریعہ سے لیے ہیں اور یہ دیانت داری برتی ہے کہ مسلسل سند کے تمام راویوں کے نام لکھ دیے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر راویوں کا حال اسماء الرجال کی کتابوں میں نہیں ملتا جس کی وجہ یہ ہے کہ محدثین نے زیادہ تر ان ہی راویوں کے حالات اسماء الرجال میں لکھے جنھوں نے حدیثیں روایت کی تھی۔ تاریخی راویوں کے حالات کے ساتھ ان کو چنداں احتیاج نہ تھی۔ اس بنا پر کثرت سے نایاب اور نادر الوجود کتابیں بہم پہنچانی ہوں گی، جن سے ان راویوں کا پتہ لگ سکے اور اس کی بنا پر ان کی روایتوں کے معتبر اور نامعتبر ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔

اس تنقید اور چھان بین کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ طبری میں سینکڑوں ایسے واقعات موجود ہیں جن کا غلط ہونا قطعاً معلوم ہے، اس لیے جب تک اس کی ایک ایک روایت کو اصول فن کے مطابق جانچ نہ لیا جائے سیرت نبویؐ میں وہ داخل نہیں کی جا سکتیں۔

طبری کے علاوہ جن لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی سوانح عمریاں لکھیں وہ ابن اسحاق اور واقدی ہیں، لیکن محدثین کے نزدیک یہ دونوں ضعیف ہیں۔ سر ولیم میور نے اپنی کتاب کی زیادہ تر بنیاد واقدی اور ابن ہشام پر رکھی ہے۔ اور اس بنا پر ان کو آں حضرت ﷺ پر نکتہ چینی کے موقعے ملے ہیں، لیکن ان کو یہ معلوم نہیں کہ واقدی اور ابن ہشام سند کے لحاظ سے بالکل غیر معتبر ہیں۔

موسیٰ بن عقبہ نے آنحضرت ﷺ کی خاص غزوات پر ایک کتاب لکھی ہے اور وہ سب سے قدیم تصنیف ہے، یعنی مصنف صحابہ کے زمانہ میں موجود تھا لیکن ہم کو جہاں تک معلوم ہے۔ تمام ہندوستان میں یہ کتاب موجود نہیں۔ مصر میں خدیو کے کتب خانہ میں ایک نسخہ موجود ہے، وہاں سے نقل لینے کا انتظام کرنا پڑے گا۔ امام بخاری کی تاریخ کبیر نہایت معتبر کتاب ہے لیکن اولاً تو نہایت مختصر ہے، دوسرے ہندوستان میں اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔

قسطنطنیہ میں اس کا ایک نسخہ جامع آیا صوفیہ میں موجود ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی نقل کا انتظام ہوسکتا ہے۔

اس سلسلہ کے علاوہ جو کتابیں ہیں مثلاً **مواهب لدنیه، دلائل النبوة، سیرت**

مغلطائی، کشف الشام، سیرت ابن سید الناس وغیرہ وغیرہ، یہ سب زمانہ مابعد کی ہیں اور ان کی روایتیں تحقیق اور تنقید کی سخت محتاج ہیں۔

۲۔ حدیث کی کتابیں اگر چہ عبادات و معاملات کے مسائل جاننے کی غرض سے تصنیف کی گئیں، لیکن ضمناً ان میں آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی اور معاشرت کے متعلق ہزاروں واقعات ملتے ہیں، لیکن چونکہ ان کتابوں کی ترتیب تاریخی انداز پر نہیں ہے، اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ حدیث کی تمام کتابیں بہم پہنچائی جائیں اور ان کو اس طرح احتیاط کے ساتھ دیکھا جائے کہ جہاں اس قسم کی کوئی بات ہے نوٹ کر لی جائے، پھر ان کو موقع بہ موقع مناسب ترتیب کے ساتھ درج کیا جائے۔ حدیث کی کتابوں میں سے بخاری اور مسلم تنقید کی محتاج نہیں۔ باقی کتابوں میں محدثانہ تنقید کی ضرورت ہے، جس کے لیے وسیع کتب خانہ اور متعدد ایسے اشخاص درکار ہیں جو فن حدیث میں مہارت رکھتے ہوں۔

۳۔ جو کتابیں خاص صحابہؓ کے حالات میں لکھی گئیں مثلاً طبقات ابن سعد جو آٹھ جلدوں میں ہے اور استیعاب، اسد الغابۃ، اکمال لابن ماکولا۔ ان میں ضمناً آنحضرت ﷺ کے بہت سے واقعات آجاتے ہیں، ان سے بہت مدد مل سکتی ہے، لیکن ان میں بھی تنقید کی بہت حاجت ہے۔ یہ کتابیں اکثر ابن سعد سے ماخوذ ہیں۔ اور ابن سعد زیادہ تر واقدی سے روایت کرتے ہیں۔ یہ بھی مشکل ہے کہ ان میں سے بعض اہم کتابیں مثلاً اکمال لابن ماکولا کا نسخہ مصر سے نقل کرا کر منگوانا پڑے گا۔

لیکن ان سب مشکلوں کے حل کرنے پر بھی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ جرمن، فرنچ اور انگریزی زبان میں آنحضرت ﷺ کی بہت سے سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں، ان میں واقعات کے متعلق جس قدر غلطیاں ہیں ان سے زیادہ واقعات سے نتائج استنباط میں ہیں۔ ان دوہری غلطیوں کا یہ نتیجہ کہ ان تصنیفات نے اسلام کی نہایت بدنما تصویر کھینچی ہے۔ اس لیے جب تک ان تصنیفات پر عبور نہ ہو اور ان کی غلطیوں اور اعتراضوں کا حفظ ما تقدم نہ کیا جائے۔ سیرت نبویؐ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے بہت کم مفید ہوگی۔ اس لیے ضرورت ہے کہ کم سے کم تمام انگریزی تصنیفات (متعلق

سیرت نبویؐ وقرآن مجید) مہیا کی جائیں اور وسیع اسٹاف مقرر کیا جائے جو ان کتابوں کے ضروری مقامات کا ترجمہ کرے۔ یہ سب سامان مہیا ہو تو اردو زبان میں ایک مبسوط اور مستند سیرت نبویؐ کی لکھی جا سکتی ہے۔قوم اور ملک کی تشنہ لبی اگر اسی حد تک ہے کہ ایسے بڑے پین (خاکہ) کی صورت دیکھ کر ڈر جائے تو اس خواہش کے اظہار کی ضرورت نہیں اور اگر قوم اس سامان کے مہیا کرنے پر آمادہ ہے تو شبلی یا شبلی نہ سہی اور بہت سے لوگ نکل آئیں گے جو اس کام کو انجام دے دیں گے۔

(روزنامہ زمیندار، جلد۳ نمبر۸، یکم مارچ ۱۹۱۲ء)

۲۔حیات سعدی اور مولانا حالی

علامہ شبلی نعمانی نے سرسید کی سوانح ''حیات جاوید'' کو کتاب المناقب اور مدلل مداحی کہہ دیا تھا تو تحریک علی گڑھ کے بعض نام نہاد ہم نواؤں نے بڑا واویلا مچایا۔اور علامہ شبلی پر طعن و تشنیع کا بازار گرم کر دیا۔حتیٰ کہ انہیں علی گڑھ تحریک ہی کا سرے سے مخالف قرار دیدیا۔بعد میں مہدی حسن افادی نے ''حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک'' لکھ کر اسے مزید ہوا دیدی۔حالانکہ بقول پروفیسر آل احمد سرور[۱۹۱۱-۲۰۰۲ء] معاملہ محض اتنا تھا کہ علامہ شبلی نعمانی کو مصور پسند تھا،اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر پسند نہ تھی۔(مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں،ص:۴)

علامہ شبلی نے حیات جاوید پر تبصرے سے بہت پہلے اپریل ۱۸۸٦ء میں حیات سعدی پر ایک عمدہ تبصراتی مضمون لکھا تھا،جس میں حیات سعدی کی عظمت کا اعتراف بڑے شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ ہماری ادبی تاریخ میں تقریباً ہر مبصر اور مضمون نگار نے حیات جاوید پر علامہ شبلی کے نقد کا ذکر کیا ہے لیکن حیات سعدی پر ان کی رائے سے چشم پوشی کی ہے۔غالبًا پروفیسر آل احمد سرور کے سوا اس کا کسی کو علم ہی نہیں تھا۔اسی طرح حیات سعدی کے متعدد ایڈیشن اور محقق ایڈیشن شائع ہوئے ہیں،مگر علامہ کے تبصرے کا ذکر کسی ایڈیشن میں نہیں ہے۔حیات سعدی کا ایک محقق ایڈیشن دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی نے بھی شبلی صدی مطبوعات کے تحت جنوری ۲۰۱٦ء میں شائع کیا ہے۔اس کے محقق اور تحشیہ نگار نے بھی اس تبصراتی مضمون کا ذکر نہیں کیا ہے۔راقم برسوں سے اس مضمون کی

تلاش میں تھا۔اللہ بھلا کرے ہمارے محقق دوست اور مشفق کرم فرما ڈاکٹر عطا خورشید صاحب کا جنہوں نے اس قیمتی تحریر کو تلاش کر کے بھیجا۔وہی نادر تحریر یہاں پیش کی جارہی ہے۔یقین ہے اس نادر تحریر کی اشاعت کے بعد حالی وشبلی کی معاصرانہ چشمک سے لطف لینے والوں کے نقطہ نظر میں تبدیلی آئے گی۔

''مولانا حالی سے ملک کو اب تک اگر یہ شکایت تھی کہ ان کا ابر کرم ایک ہی سمت برس کر رہ گیا،یعنی ان کی جادو بیانی صرف نظم اردو پر محدود رہی تو ''حیات سعدی'' نے یہ شکایت بھی رفع کردی۔اب نثر اردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ مولانا حالی کی نگاہ التفات نے ادھر بھی رخ کیا۔

ملک کے جو نامور مصنف اردو زبان میں معلومات سودمند کا ذخیرہ مہیا کر رہے ہیں ان میں مولوی حالی صاحب کا قدم سب سے آگے ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ سعدی ایسے شخص کی لائف سیکڑوں دلچسپ اور پرمزہ واقعات سے معمور ہوگی مگر افسوس ہے کہ مصنف کو جو کچھ اس خزانہ سے ہاتھ آیا وہ من میں چھٹانک بھی نہیں۔مصنف کا یہ عذر بالکل صحیح ہے کہ جن تصنیفات سے اس کو مدد ملنے کی امید تھی وہ آپ کم مایہ تھیں۔

جس دریا سے اس نے چشمہ نکالا وہ خود پایاب تھا۔

ادھر مصنف کو یہ بھی منظور تھا کہ وہ کوئی بات تاریخی سند کے بغیر زبان سے نہ نکالے،ورنہ اگر'' آب حیات'' کے مصنف کی طرح وہ بھی بازاری قصوں کو آب ورنگ دے کر لکھنا چاہتا تو مضمون کی تعداد بہت کچھ بڑھا دیتا، جس کے ساتھ عوام سے اس کو حسن قبول کی سند بھی مل جاتی۔

غرض لایف کے متعلق تو مصنف کو حسرت کے ساتھ انہی پہلے تذکروں اور تصنیفوں کا دست نگر رہنا پڑا،جن کے دامن میں چندخزف ریزوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔لیکن جہاں شیخ کی تصنیفات اور اس کی شاعری

کے متعلق نکتہ سنجی کی ہے وہ مصنف کی طباعی اور سخندانی کا مشہوراور نامور میدان ہے۔

کس موشگافی سے اس نے دکھایا ہے کہ سعدی کا کام نیچرل خوبیوں کے لحاظ سے کس قدر اپنی ہم سر تصنیفات سے ممتاز ہے۔ واقعی جن محفلوں میں صراحی کے قہقہہ اور قلقل مینا کے سوا اور کوئی صدا نہ بلند ہو وہاں وعظ و پند کے سوکھے فقرے سنا کر اہل بزم کو اپنی طرف کھینچنا سعدی ہی کی سحر طرازی اور اعجاز بیانی کا اثر ہے۔

مولانا حالی ہی نے لوگوں کو یہ خیال دلایا کہ جس زمانہ میں دنیا شخصی حکومتوں کے قبضہ میں آزادی کا سبق بھول چکی تھی اس وقت بھی سعدی ایسے حق پرست موجود تھے جو آزادی پر جان دیتے تھے اور جن کی نظیر آج بھی بمشکل مل سکتی ہے۔ ناظرین شاید بعض باتوں میں مصنف سے الجھیں۔ مثلاً اس بات میں کہ انہوں نے جب سعدی کی ایک ایک بات کی حمایت کی تو اس حکایت کا ''قضارا من و پیرے از فاریاب'' جس میں ایک سپر نیچرل واقعہ کا ذکر ہے کیا جواب دیں گے۔۔ یا نظامی کے مقابلہ میں سعدی کے رزمیہ اشعار پیش کرنے یا پانچویں باب گلستاں کی بعض فحش حکایتوں کے ذکر سے چشم پوشی کرنے۔ یا واقعہ سومنات کی زبردستی تاویل کرنے اور اس قسم کی بعض باتیں۔ مگر حق یہ ہے کہ اس قسم کی رائیں اجتہادات میں شامل ہیں جس میں ہم کسی مجتہد کی زبان نہیں پکڑ سکتے۔ اس کے علاوہ کسی پرفضا باغ کی خوبی اس وجہ سے کم نہیں ہو جاتی کہ جہاں اس میں ہزاروں خوشنما پھول ہیں وہاں دو ایک خار بھی ہیں۔''

شبلی

۱۹/اپریل ۱۸۸۶ء

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۴/اپریل ۱۸۸۶ء)

۳۔محمد عبدالقوی فانی

مولوی عبدالعلی آسی مدراسی کے صاحبزادے مولوی عبدالقوی فانی سابق پروفیسر شعبہ فارسی لکھنو یونیورسٹی تحصیل علم کے لئے یورپ جانا چاہتے تھے۔اس کے لئے انہیں مالی تعاون کی ضرورت تھی۔چنانچہ انہوں نے نظام حیدرآباد کی خدمت میں مالی معاونت کے لئے درخواست دی۔اس درخواست کے ساتھ علامہ شبلی کی ایک سفارشی تحریر بھی منسلک کی تھی جو پروفیسر شاہ عبدالسلام سابق پروفیسر لکھنو یونیورسٹی کو اپنے خاندانی کاغذات میں ملی تو اسے انہوں نے ماہنامہ معارف فروری ۱۹۹۹ء میں ایک نوٹ کے ساتھ شائع کرایا۔چونکہ وہ تحریر علامہ شبلی کے کسی مجموعہ تحریرات میں شامل نہیں ہے،اس لئے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

''مولوی عبدالقوی صاحب بی اے کو جو سرٹیفکٹ ان کے اساتذہ اور سکریٹری کالج نے دئے ہیں اس کے بعد اگرچہ میری تصدیق بیکار چیز ہے لیکن بطور واقعہ کے میں اظہار کرتا ہوں کہ وہ نہایت لائق،ذہین،قابل شخص ہیں۔انشاپردازی میں ان کو خاص مذاق ہے اور تاریخ کے ساتھ ان کو نہ صرف مناسبت بلکہ شغف ہے،چونکہ وہ فطرۃً علمی مذاق رکھتے ہیں اس لئے ان کا علمی اشغال میں مصروف ہونا قوم اور ملک کے لئے مفید ہوسکتا ہے۔

وہ تحصیل و تکمیل علم کے لئے یورپ جانا چاہتے ہیں اور درحقیقت ان کا یورپ جانا بہت مفید ہوگا اور اس میں ان کو مدد دینا ایک علمی خدمت ہے۔

شبلی نعمانی

۷/فروری ۱۹۱۱ء

لکھنو

(ماہنامہ معارف فروری،۱۹۹۹ء،ص۱۵۰-۱۵۱)

ایک نادر خط بنام قاضی عبدالرحمٰن حیرتؔ

مکتوبات شبلی کی دریافتوں کا سلسلہ ہنوز قائم ہے۔گذشتہ سال ۲۰۲۱ء میں دارالمصنّفین سے ناچیز کی مرتبہ کتاب ''مکتوبات شبلی'' شائع ہوئی۔ جو علامہ شبلی کے ۳۱۷ر متفرق اور نو دریافت خطوط کا مجموعہ ہے۔اس کی اشاعت کے بعد مجلّہ نقطہ نظر اسلام آباد کے شبلی نمبر (مدیر ڈاکٹر سفیر اختر) سے ۵ر اور غیر مدون خطوط ہاتھ آئے جسے راقم نے ''افادات شبلی'' میں شامل کر دیا ہے۔ان خطوط کی اشاعت سے'' مکاتیب شبلی'' کی مجموعی تعداد ۱۲۲۷ر ہوگئی تھی۔

حال میں علامہ شبلی کا ایک اور خط بنام مولوی قاضی عبدالرحمٰن حیرتؔ اعظم گڑھی استاد نیشنل اسکول اعظم گڑھ ان کی تصنیف '' گلدستہ تہذیب'' حصہ دوم سے دستیاب ہوا ہے۔ یہ خط انہوں نے بطور نمونہ سر سید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) کے خطوط کے ساتھ نقل کیا ہے۔اس خط کی اشاعت سے علامہ شبلی کے مطبوعہ خطوط کی مجموعی تعداد اب ۱۲۲۸ر ہوگئی ہے۔نو دریافت خط درج ذیل ہے:

'' آپ کی تعلیم سے بہت لوگ مستفید ہو رہے ہیں،لیکن اب تک ہمارا خاندان محروم ہے۔اس لئے عزیزی عارف کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اس کو تعلیم اور تعلیم سے زیادہ تربیت کی ضرورت ہے۔ براہ مہربانی خاص توجہ مبذول رکھئے گا۔ والسلام

شبلی نعمانی

۲۲ر جنوری ۱۹۰۶ء

[اپر پرائمری ریڈر گلدستہ تہذیب، حصہ دوم، ص ۱۶۶]

یہ چند سطری خط کئی وجوہ سے اہمیت کا حامل ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ علامہ شبلی نعمانی اپنے اعزہ کی تعلیم و تربیت کے لئے کس درجہ فکر مند رہا کرتے تھے۔ یہ بات ان نو دریافت خطوط سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو

گذشتہ برس حامدحسن نعمانی کے نام دریافت ہوئے تھے اور جواب ''مکتوبات شبلی'' کے جدید ایڈیشن میں شامل ہیں۔

اس خط سے پہلے مکتوب الیہ قاضی عبدالرحمٰن حیرتؔ کو علامہ شبلی نے علی گڑھ بلایا اور تعلیم کے سلسلہ میں اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کیا اور پھر اپنے بیٹے حامدحسن نعمانی (۱۸۸۰-۱۹۴۲ء) اور چھوٹے بھائی مسٹر جنید نعمانی (م:۱۲/اپریل ۱۹۳۳ء) کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری انہیں سونپی تھی۔ بعدازاں اپنے نواسے عارف کی تعلیم وتربیت کے لئے انہیں مذکورہ خط لکھا۔

گذشتہ سال ہمارے دوست مولوی محمد عرفات اعجاز اعظمی سلمہ نے گورکھپور سے ایک کتبہ بھیجا تھا جو اس طرح ہے:

عارف

نواسہ

شبلی نعمانی

۱۳۴۰ھ

یہ کتبہ گورکھپور کے 'مبارک خاں شہید قبرستان' جو نارمل ٹیکسی اسٹینڈ کے پاس واقع ہے، ایک قبر کا ہے۔ علامہ شبلی کے ایک نواسے کا نام (حافظ) محمد عرفان تھا، جو مرحوم وسیم احمد سابق وزیر تعلیم بیسک ایجوکیشن اترپردیش کے والد تھے۔ ان کے نام سے خیال ہورہا تھا کہ عارف غالباً ان کے بھائی رہے ہوں گے۔ ہمارا یہ قیاس سچ نکلا۔ قاضی عبدالرحمٰن حیرتؔ نے اس خط پر حاشیہ لکھا ہے کہ یہ علامہ شبلی کے نواسے ہیں۔ (ایضاً) مگر ابھی یہ بات تصدیق طلب ہے کہ عارف علامہ شبلی کی دونوں بیٹیوں فاطمہ خانم اور رابعہ میں کس کے بیٹے تھے۔؟

راقم کی ایک کتاب ''شبلی کے مکتوب الیہ'' جو گذشتہ برس ادبی دائرہ سے شائع ہوئی ہے اس میں علامہ کے ۱۳۰/مکتوب الیہ کا تذکرہ شامل ہے۔ اب نئے مکتوب الیہ مولوی قاضی عبدالرحمٰن حیرتؔ کے ذکر سے ان کی تعداد (۱۳۱) ہوگئی ہے۔

علامہ شبلی کے نودریافت خطوط ومراسلات کے ازسرنو مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اس سے

ذکروفکراور''حیات شبلی'' میں متعددنئی باتوں کااضافہ ہوگا۔بالکل اسی طرح جس طرح ''شذرات شبلی''اور''افادات شبلی'' کی اشاعت سے ہوا ہے۔

دونادرخطبات شبلی

علامہ شبلی نعمانی[۱۸۵۷-۱۹۱۴ء]ایک بڑےادیب وانشاپرداز کےساتھ ایک بڑے مقررو خطیب بھی تھے اور بڑی شاندار تقریریں کیا کرتے تھے۔دینی جلسوں،آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء کےسالانہ جلسوں وغیرہ میں وہ مسلسل خطبات دیا کرتے تھے۔بعض لوگ تومحض ان کی تقریروں کے سننے کے لئے ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں جایا کرتے تھے۔ان کے خطبات کے دومجموعے شائع ہوئے ہیں۔پہلا مجموعہ۱۹۴۱ء میں ان کے شاگردعزیز اور نامور ادیب وانشاپرداز مولانا عبدالسلام ندوی نے مرتب کیا تھا جودارالمصنّفین اعظم گڑھ اور بعض دوسرے اداروں سے مسلسل شائع ہورہا ہے۔جبکہ دوسرا مجموعہ''خطبات شبلی نو دریافت'' گذشتہ سال ناچیز نے مرتب کیا ہے،اسے بھی دارالمصنّفین اعظم گڑھ ہی نے شائع کیا ہے۔اس کے بعد ناچیز کوبعض خطبات اورخطبات کے چندٹکڑے کتابوں اورروداودں سے ہاتھ آئے۔یہاں ان کی تفصیل پیش کرنااورقدردانان شبلی کوان سے آگاہ کرنامقصود ہے۔

تحریک ندوۃ العلما کاچوتھا جلسہ ۲۱ تا۲۳/مارچ ۱۸۹۷ءکومیرٹھ میں منعقد ہوا تھا۔ علامہ شبلی اس میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ مفصل تقریر بھی کی۔مگرکسی وجہ سےاس تقریر کا خلاصہ روداد ندوہ میں نقل نہیں ہوسکا ہے۔چونکہ وہ خلاصہ علامہ کے خطبات کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے،اس لئے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> ''انگریزی تعلیم کی وجہ سے مذہبی تعلیم میں جودقت اورخرابی پیش آگئی ہےاس کی اصلاح کے لئے اب تک جوتدبیریں اختیارکی گئی ہیں وہ سودمند نہیں ہوئیں۔ان مشکلات پرنظرکرکے امروہے کے ایک مسلمان رئیس نے اپنی محنت ووقت صرف کرکےاس بات کی کوشش کی کہ انگریزی مدرسوں میں

> مذہبی تعلیم کا وقت دیا جائے ،اس کے واسطے وہ دو مہینے نینی تال میں جا کر رہے اور آخر کو ایک حد تک کامیاب ہوئے گورنمنٹ نے ہفتے میں دو بار نصف نصف گھنٹہ مذہبی تعلیم کے واسطے دیا ہے اور اس کا انتظام اور نصاب درس کا ردوبدل مسلمانوں کی تجویز پر رکھا ہے۔
>
> مولوی مشتاق حسین صاحب رئیس امروہہ نے اس کے واسطے قواعد علاحدہ چھپوا لئے ہیں جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہیں۔ان کی خواہش یہ ہے کہ ندوۃ العلما اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے۔اس کو جس طریقے سے مناسب ہو جاری کرے اور نصاب درس تجویز کرے۔لہٰذا میں اس کو پیش کر کے یہ تحریک کرتا ہوں کہ اس رعایت کے بابت گورنمنٹ کا اور اس کوشش کے بارے میں مولوی مشتاق حسین صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے۔
>
> (روداد جلسہ چہارم ندوۃ العلما،ص:۸۴)

ذہنی ہم آہنگی کے سبب علامہ شبلی ابتدا ہی سے تحریک ندوہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔اور بڑی پابندی سے اس کے پروگراموں اور سالانہ اجلاسوں میں شریک ہوتے۔اس زمانہ میں ندوہ ان کی تحریر و تقریر کا عام موضوع تھا۔یہی وجہ ہے کہ ندوہ کا مفہوم،ندوہ کی ضرورت اور علما کے فرائض وغیرہ کے موضوع پر ان کی متعدد تقریریں ملتی ہیں۔خطبات شبلی از مولانا عبدالسلام ندوی اور خطبات شبلی نو دریافت میں اس موضوع پر ایک ایک تقریریں شامل ہیں۔حال میں اس موضوع پر ایک اور تقریر کا خلاصہ مولانا سید امجد علی اشہری کی کتاب میں ملا ہے، جسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

ندوہ کی ضرورت

ندوہ کی ضرورت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا اور اگر چہ اس کی ضرورت ثابت کرنے کا یہ وقت نہیں ہے، تاہم اس کی اہمیت ہمیں ہر وقت یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ اس کی حقیقت و ماہیت

اس کے قیام کی اشد ضرورت اور یہ کہ اس کی ضروریات کیا کیا ہیں اور مسلمانوں کو کیسی کیسی امیدیں اس سے وابستہ ہیں، یہ باتیں قوم کو اچھی طرح ذہن نشین ہونی چاہئیں۔ تب اس کے وجود سے قوم کو مطلوبہ فوائد اور اہم نتائج حاصل ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب تک کسی چیز کی اصلیت اور وقعت ہی انسان کے دل میں نہیں جمتی تب تک نہ وہ اس کی جانب پوری توجہ کر سکتا ہے، نہ اس سے کماحقہ مستفید ہونے کی کوشش۔ اسی وجہ سے بہت سی اہم تجاویز اور عظیم الشان کاموں کے متعلق بعض افراد قوم کی امیدیں موہوم ثابت ہوتی ہیں اور ان کا وجود غیر ضروری و بے سود۔

قیام ندوہ کے مسلمانوں کے دو گروہ تھے۔ علمائے کرام کے حالات و خیالات اس کے بارہ میں کچھ اور تھے، جدید الخیال لوگوں کے کچھ اور۔ اور دونوں کی رایوں میں اختلاف عظیم، مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ سارے ہی بڑے کاموں میں ابتداءً ایسا ہوا کرتا ہے، لیکن ان اختلافات اور ابتدائی مشکلات کی وجہ سے اولوالعزم گھبرا نہیں جایا کرتے۔ اور اسلام میں تو ایسے اختلاف کو رحمت بتایا گیا ہے۔ اس کی تو تعلیم ہی یہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں سے روشن خیالی، تحمل، حوصلہ اور استقلال کو کام میں لا کر فائدہ اٹھایا جائے، اسی پاک اور قابل تقلید طرز عمل کی بدولت سلف صالحین کے مبارک زمانوں میں قوم کو بڑے بڑے عظیم الشان فوایدحاصل ہوتے رہے۔ اسی شیوۂ محمود کے طفیل ابتدائے اسلام اور اس کی چند شروع صدیوں میں مسلمانوں سے وہ وہ کام بن پڑے جن کی نظیر زمانہ بعد کے صدہا سالوں میں بھی نہ لا سکا اور نہ لا سکے گا۔

قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے سبق آموز عجیب و غریب حالات، جمع قرآن کی کیفیت، زمانہ صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں جمع احادیث کی ضرورت، علوم تفسیر و فقہ وغیرہ کی تدوین، علوم یونان اور روم و شام وغیرہ کے عربی تراجم، ادب، عرب کا ابتدائی زمانہ پھر اس میں اقوام غیر کے علوم کا اضافہ۔ اور بالآخر لسان العرب کا انواع، علوم و فنون کے خزائن سے مالا مال ہونا وغیرہ وغیرہ بیان فرما کے کہا کہ سلف نے تو اپنے زمانہ میں ضرورت وقت کو اچھی طرح سمجھا۔ اور اس کو پورا کرنے کا حق ادا کر گئے، لیکن زمانہ دن بدن ترقی پر ہے۔ اس کی ضروریات بھی ہمیشہ بڑھتی جاتی ہیں اور حالت موجودہ ہم سے بزور یہ کہلواتی ہے کہ اب بھی اسی طرح ہمیں اصلاح و ترقی

علوم وفنون کی از بس احتیاج ہے۔ پس سلف کی طرح ہمارا بھی یہ فرض ہے کہ غیر اقوام کے علوم و فنون سیکھیں۔

میرے پچھلے بیان کا بہت ہی ضروری ماحصل یہ ہے کہ اس مبارک زمانہ کے علمائے اسلام نے دوسری قوموں کے علوم وفنون کو اپنی زبان میں لینے سے ہرگز تعصب نہیں کیا۔ اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال فاسد ہوتو تاریخ شاہد ہے جو بڑی زبردست نظیروں سے اس کی تردید کرتی ہے۔ مسلمان اگر تعصب برتتے تو یونانی فلسفہ اور سائنس کی تحصیل میں شاقہ محنتیں کیوں اٹھاتے؟ مگر انہوں نے ان علوم کو بشوق ورغبت سیکھا اور ایسا سیکھا جیسے سیکھنے کا حق ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے علم کلام کو بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ انہوں نے غیر اقوام کے علوم سے فائدہ اٹھانے میں کس فراخ دلی اور بے تعصبی سے کام لیا ہے اور کیوں نہ لیتے؟ ان کے نزدیک تو علم مومن کی کھوئی ہوئی دولت تھی کہ جہاں پائے اٹھالینی چاہئے۔ وہ اسلام کو خدانخواستہ کسی پہلو سے کمزور اور بودا بھی نہ جانتے تھے۔ جو اس ڈر کے مارے ان علوم سے اجتناب کرتے کہ کہیں یہ (علوم) اسلام کو کسی طرح کا گزند نہ پہنچائیں یا ان کے مقابلہ میں اسلام کے اصول وعقائد کی بنیادیں متزلزل نہ ہوجائیں۔ معاذ اللہ۔ جیسے زمانۂ حال کے بعض علما کا یہ خیال ہے کہ مذہب میں عقل کو دخل نہ دو۔ یا مانا کہ تنہا عقل کی روشنی کافی نہیں ہوسکتی۔ مگر نعوذ باللہ ایسا بھی تو نہ ہو کہ اسلام کو خلاف عقل (غیر معقول) سمجھا یا جائے بحالیکہ عقل ہی کی وجہ سے انسان اس سارے بار کا مکلّف ہے۔ سلف صالحین کے بھی اگر یہی خیالات ہوتے تو اپنے دعاوی وعقائد کو دلائل عقلیہ سے کیوں ثابت کرتے؟ معقولات سے اسی طرح نہ بچتے، جس طرح اسلام کے نادان دوست دور بھاگتے ہیں۔ شرح مواقف کو دیکھو، اس کا دوتہائی حصہ علوم یونان سے ماخوذ ہے، پھر یہ کہ جن علوم کو ہم نے غیر قوموں سے لیا ان کو اپنا سمجھ کر ان کی حفاظت وحمایت کی۔ چنانچہ اس کا ثبوت اب تک یہ حال ہے کہ اگر کوئی طب یونانی کو برا کہے تو ہمیں ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ گویا کہ وہ ہماری اپنی چیز ہے۔ یہی تو باتیں تھیں جن کی وجہ سے مدت قلیل کے اندر اندر مسلمانوں کا چاردانگ عالم میں ڈنکا بج گیا۔ اوران کے بین کارناموں کا اک زمانہ اب تک اعتراف کرتا ہے۔

مگر ناظرین میری تقریر سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ آج کل کے علمائے اسلام میں علوم کی وہ پیاس نہیں ہے جو اس زمانہ میں تھی۔ یا یہ کہ علماء ان علوم جدیدہ سے کچھ بیر یا تعصب رکھتے ہیں، نہیں نہیں بلکہ حقیقت میں بات اور ہی ہے کہ وہ یہ کہ ان کے نزدیک علم وفن جسے کہتے ہیں یورپ میں اس کا نام نہیں۔ آج اگر اس غلط فہمی ولاعلمی کا پردہ ہٹ جائے تو اسی شوق وسرگرمی سے علوم مغربیہ کی تحصیل پر متوجہ ہو جائیں جیسے اسلاف ہوئے تھے۔ پس اب ضرورت کا ہے کی ہے؟ یہی کہ علماء کو کسی طرح آگاہی ہو۔ انہیں پتہ لگے کہ یورپ اس وقت علمی خزانوں سے مالا مال ہے مسلمانان ہند اس امر سے بے خبر ہوں تو ہوں۔ اب تو بعض ممالک اسلامیہ میں بھی البتہ یورپ کی کتب کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ مثلاً بلاد شام ومصر وبیروت وغیرہ۔ دیگر علوم کو جانے دو خود آپ کی عربی کا علم جس قدر وہاں ہے ہم میں نہیں۔ مجدالدین شعر آبادی کی قاموس لغت کی سب سے اخیر کتاب ہے سب سے اول کتاب میں ۴۰ ہزار مادے تھے۔ پھر ساٹھ ہزار ہوئے اب لسان العرب میں اسی ہزار مادے ہیں اور اس پر بھی ہزار ہا الفاظ کا اضافہ ہو گیا اور ہوتا جاتا ہے کہ جن کا ہماری کتب لغت میں کہیں پتہ نہیں چلتا۔ پس زبان عربی اور علوم اسلامی کی روز افزوں ضروریات پر متوجہ ہونے کی کیسی سخت احتیاج ہے، مگر افسوس ہم سے تو کچھ ہو نہیں سکتا۔ ہاں غیر اقوام البتہ اس نعمت اور سعادت سے خوب حصہ لے رہی ہیں۔ نہ صرف اپنا بلکہ ہمارے حصہ بھی۔ یورپ کی علمی سوسائٹیوں نے عرب جاہلیت کے اشعار کو کس کس تلاش وتجسس سے بہم پہنچایا ہے۔ جرمنی میں کتب عربیہ کے انطباع اور ترجمہ وغیرہ میں کیسا کچھ اہتمام کیا گیا ہے، پڑھ پڑھ کر عقل حیران ہوتی ہے اور اپنی قومی پستی وکم حوصلگی پر رونا آتا ہے۔

پس اے مسلمانو! ابونصر فارابی اور بوعلی سینا وغیرہما نے جس طرح فلسفہ یونان کے مقابل پر اسلامی علم کلام ایجاد کیا تھا۔ اسلام کی حمایت وحفاظت اور اہل اسلام کی اصلاح وترقی کے لئے اب بھی ویسا ہی ہونا ممکن ہے۔ بشرطیکہ پہلے علوم یورپ سے آگاہی حاصل کریں۔

یہی اہم مقاصد ندوہ کی غرض وغایت ہیں۔ انہی سے بخوبی واقف ہونے پر بعض لوگوں کا یہ اعتراض اٹھایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی دیگر موجودہ انسٹی ٹیوشنوں سے بڑھ کر ندوہ کا

کون سا انوکھا مقصد ہے؟ ہمیں اس بات کا اعتراف اور افسوس ہے کہ ان مقاصد میں ندوہ کو اب تک کوئی نمایاں کامیابی نہیں ہوئی، مگر اس میں ندوہ کی کچھ خطا نہیں۔ یہ ہمارا اپنا قصور ہمت ہے یا عدم فرصت اور یہ بدظنی کہ یورپ علوم سے تہی دست ہے۔ ان موانع کے ہوتے اس قلیل مدت میں کوئی بہت ہی زبردست کارنامہ نہ دکھلا سکنے پر ندوہ معذور سمجھا جانا چاہئے۔ ہماری قوم میں اس وقت دو گروہ ہیں، کاروباری اور علمی۔ دونوں کے مشاغل مختلف ہیں۔ قومی ترقی کا اصل اصول تو یہ ہے کہ اس کے افراد میں کاروباری اشغال سے واسطہ رکھنے والے ہوں تو ساتھ ہی علوم وفنون کو ترقی دینے والے بھی ہوں۔ برخلاف اس کے ہمارے نوجوانوں میں مادی ترقی کا شوق ہے تو دین اور علوم وفنون کی طرف سے بے اعتنائی۔ یہ خرابی نہ ہوتی تو ندوہ کی ضرورت بھی کیا تھی۔؟ چاہئے کہ علم اپنی غرض وغایت آپ ہی سمجھا جائے۔ ندوہ کو ایسے ہی طالبانِ علم کی ضرورت ہے اور اسی قسم کے خادمانِ علوم وفنون وہ پیدا کیا چاہتا ہے۔

(ماخذ: مرقع تاج پوشی، حصہ دوم، ص:۳۴-۳۸)

علامہ شبلی کے متعدد خطبات کی دریافت اور ''خطبات شبلی نودریافت'' اشاعت کے بعد بھی کئی خطبات یا ان کے اقتباسات دریافت ہوئے ہیں جو ناچیز کے سلسلہ مضامین ومقالات ''بیان شبلی'' میں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ البتہ اب ان نئی دریافتوں کے بعد ''خطبات شبلی'' کے ایک جامع اور مکمل مجموعہ کی اشاعت ضروی ہے۔

دو نادر فارسی غزلیں

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) نے اپنے فارسی کلام کے چار مجموعے شائع کئے۔ دو نظموں کے مجموعہ نظم شبلی اور دیوان شبلی۔ اور دو غزلوں کے دستہ گل اور بوئے گل خود شائع کئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد مولانا حاجی معین الدین ندوی (۱۸۹۱-۱۹۴۱ء) نے ان کے متفرق کلام کا مجموعہ برگ گل دار المصنفین سے شائع کیا۔ بعد ازاں ان سب کا ایک مجموعہ مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) نے ''کلیات شبلی فارسی'' کے نام سے شائع کیا، مگر اس کی جمع وتدوین میں

انہوں نے وہ کاوش اور اہتمام نہیں کیا جو ''کلیات شبلی اردو'' کی اشاعت میں کیا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی کا متعدد کلام اس میں شامل ہونے سے رہ گیا۔ کلیات شبلی کی اشاعت کے بعد علامہ شبلی نعمانی کا جو کلام دریافت ہوا اسے مولانا سید سلیمان ندوی اور ماہنامہ معارف کے دوسرے مدیروں نے معارف میں شائع کر کے محفوظ کر دیا ہے۔ ماہنامہ معارف کے علاوہ بعض دوسرے کتب و رسائل میں بھی علامہ شبلی کا وہ کلام جو ''کلیات شبلی'' میں شامل نہیں ہو سکا ہے شائع ہوا ہے۔ راقم نے ''نوادرات شبلی'' میں انہیں یکجا کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی بعض غزلیں اور اشعار دستیاب ہوئے۔ اسی نوع کی ایک فارسی غزل گذشتہ سال ''افادات شبلی'' میں نقل کی گئی ہے۔

اس سال کے مطالعہ شبلی میں نثری نوادر کے ساتھ دو نادر فارسی غزلیں اور ایک شعر بھی دستیاب ہوئے۔ پہلی غزل مولانا ظفر علی خاں کے ماہنامہ پنجاب ریویو لاہور اگست ۱۹۱۰ء کے شمارہ میں شائع ہوئی ہے اور ''کلیات شبلی فارسی'' میں شامل نہیں ہے۔ وہ درج ذیل ہے:

زعیاری بمن نا آشنا بودہ است دانستم   تغافل ہائے بے جایش بجا بودہ است دانستم
پئے مشق فریب آغاز کار از سادۂ خواہد   نوازش ہائے آں شوخ از کجا بودہ است دانستم
ترا نکہت زلفے دریغ از من نمی باشد   اگر کوتاہی بود از صبا بودہ است ، دانستم
بجا بود اے عدو گر زحمت خود از میاں بردی   کہ خوئے شوخ من صبر آزما بودہ است دانستم
غلط ہست ایں کہ آئیں ہم آغوشی نمی داند   گرہ در کارم از بند قبا بودہ است دانستم
ستم ہائے بتاں را خود بہ من خاطر نشیں سازد   نگار شوخ من مہر آشنا بودہ است دانستم
شکایت ہر کہ آرد بادہ می بخشد بہ او ساقی   کہ ایں جا ہر مرض را یک دوا بودہ است دانستم
بہ یاراں مے خوزیم و فرض و سنت ہم بجا آریم   مدار شرع بر ترک ریا بودہ است دانستم
کنار و بوس او یک جرات رندانہ مے خواہد   از و ناکامی ماہم زما بودہ است دانستم

قدم در راہ رندی مے نہدا ماہی لغزد
مگر زیں پیش شبلی پارسا بودہ است دانستم

(ماہنامہ پنجاب ریویو لاہور اگست ۱۹۱۰ء، ص ۲۲)

مولانا ظفرعلی خاں[۱۸۷۴-۱۹۵۶ء] نے ماہنامہ دکن ریویو حیدرآباد کے بعد ۱۹۱۰ء میں لاہور سے ماہنامہ ''پنجاب ریویو'' جاری کیا۔ اس رسالہ نے اگرچہ بہت کم عمر پائی اور تقریباً ایک ہی سال میں سلسلہ طباعت منقطع ہوگیا، مگر اس مختصر سی مدت میں بھی اس میں علامہ شبلی کی کئی تحریریں اور غزلیں شائع ہوئیں۔

مولانا ظفرعلی خاں نے کئی رسائل کا اجرا اور ادارت کی اور تقریباً ان تمام رسائل کے لئے علامہ شبلی نے انہیں اپنے مقالات، غزلیں اور نظمیں وغیرہ فراہم کیں۔ یہ تحریریں مولانا ظفرعلی خاں ایک عزیز شاگرد کی طرح نہ صرف ان سے حاصل کر لیتے بلکہ بڑے اہتمام سے شائع بھی کیا کرتے تھے۔

علامہ شبلی ۲۵رفروری ۱۹۱۱ء کو مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے۔ اس جلسہ میں انہوں نے ''مسلمانوں کے خواب کی تعبیر'' کے عنوان سے ایک بڑی پراثر نظم پیش کی جسے مولانا ظفرعلی خاں نے ان سے حاصل کرلیا اور اسے ماہنامہ پنجاب ریویو میں شائع کیا۔ اس پر انہوں نے ایک اشاعتی نوٹ لکھا ہے کہ

> ''۲۵رفروری کو پنجاب کے مسلمانوں کا جو عظیم الشان جلسہ لاہور میں اسلامی یونیورسٹی کے مقاصد کی تائید اور اس کے واسطے سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے منعقد ہوا تھا، اس میں جناب علامہ شبلی نعمانی مدظلہم نے ایک بلیغ نظم ارشاد فرمائی تھی جس کے ایک ایک مصرعہ نے ان ہزارہا سامعین سے جو اس موقعہ پر موجود تھے، خراج تحسین وصول کیا۔ یہ نظم علامہ ممدوح نے اس شفقت آمیز توجہ کے اقتضا سے جو ایک بلند پایہ استاد نے اپنے کسی ہیچ مایہ شاگرد کے حال پر مبذول کیا کرتے ہیں ہمیں پنجاب ریویو میں شائع کرنے کی غرض سے مرحمت فرمائی تھی۔''

(ماہنامہ، پنجاب ریویو لاہور مئی جون ۱۹۱۱ء ص ۴۶)

اس سے پہلے بھی جب مولانا ظفرعلی خاں نے حیدرآباد سے ''دکن ریویو'' جاری کیا تھا،

اس میں بھی علامہ شبلی نے مضامین اورغزلوں کے علاوہ ''شعرالعجم'' کاایک غیرمطبوعہ باب ہی اشاعت کے لئے انہیں دیدیا تھا۔لائق شاگرد نے اس کاذکر بڑےفخریہ انداز میں شکرگذاری کے طور پر کیاہے۔ان کاایک شعر ہے:

یہ فیض صحبت علامہ شبلی کا صدقہ ہے
کہ دنیائے ادب میں دھوم ہے میرے مقالوں کی

دوسری غزل پیارے لال شاکرمیرٹھی کے ماہنامہ ادیب الہ آباد سے ہاتھ آئی ہے۔وہ اکتوبر۱۹۱۱ء کے شمارہ میں چھپی ہےاورکلیات میں جگہ پانے سے وہ بھی محروم ہے۔غزل یہ ہے:

جان من بوسہ شمرون نہ زآئیں باشد — زاں کہ رسم است ایں کارنخمیں باشد
ورق بخت من ، امروز شکن ہا دارد — ایں ہما است کہ در جبہ تو چیں باشد
تاکدامیں چمن حسن گذشت از نظرم — کہ ہنوزم ورق دیدہ ، نگاریں باشد
وعدۂ قتل بمن کرد ، وزکم حوصلگی — باورم نیست کہ ایں ہم پئے تسکیں باشد
خودتو دانی کہ مرا روئے سخن باکہ بود؟ — گرحدیث ازگل وازمی کہ بہ آئیں باشد
زاہد ابر تو فن شرع مسلم داریم — کارعشق اربگذاری کہ بہ آئیں باشد
بزم ہر چند کہ برہم شد و چیدند بساط — ہم چناں مستیم از بادۂ دوشیں باشد
نکتہ شرع کہ از دل بہ زباں می نابد — وائے ، اگر دستخوش زاہد بد بیں باشد
شیخ ما،توبہ زمے کردہ تحسیں طلب است — ویں نے کاراست کہ شائستہ تحسیں باشد

می گذشتی و بہ انگشت نشاں می دادند
''آں کہ دین ودل شبلی بر بود''ایں باشد

(ماہنامہ ادیب،الہ آباد،اکتوبر۱۹۱۱ء،ص۲۰۲)

ان دریافتوں کے سبب''کلیات شبلی''فارسی کی تدوین جدید کا تقاضہ اور بڑھ گیا ہے۔

[۲]

بیانِ شبلی

مطالعہ شبلی کا سلسلہ ''بیانِ شبلی'' اس قدر دراز اور اس قدر مقبول ہوگا، میرے وہم وخیال میں بھی نہ تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ ابتک یہ سلسلہ قائم اور مقبول ہے ۔اس سلسلہ کا تیسرا حصہ پیش خدمت ہے۔ بیانِ شبلی حصہ دوم کے بعد حصہ سوم کے لئے درج ذیل معلومات دستیاب ہوئیں:

خلاصہ انتخاباتِ شبلی

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جب اردو زبان وادب کی تعلیم وتدریس کا سلسلہ دراز ہوا اور عہد گذشتہ کے ارباب شعروادب کے کارنامے پڑھائے جانے لگے تو نصابی ضرورتوں کے پیش نظر بزرگ ادیبوں کی تخلیقات کے انتخابات شائع ہوئے اور درجات میں پڑھے پڑھائے جانے لگے۔ ان بزرگ ادیبوں میں علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کی تخلیقات بھی شامل ہوئیں۔ چنانچہ علامہ شبلی کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) نے ۱۹۴۰ء میں علامہ شبلی کی ادبی کتابوں شعرالعجم اور موازنہ انیس و دبیر وغیرہ سے ان کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب شائع کیا۔ اور اس کا نام ''انتخاباتِ شبلی'' رکھا۔ یہ انتخاب دراصل انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی فرمائش پر کیا تھا۔ چنانچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اسے ایف اے کے نصاب میں شامل کیا۔ اس کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ

> ''اس انتخاب میں ایک خاص پہلو یہ پیش نظر رکھا گیا ہے کہ کلام کے حسن و
> خوبی اور خاص طور سے شعر کی تنقید اور اس کے محاسن ومعائب کے اصول کو

ان کی ان دو کتابوں (شعرالعجم ،موازنہ انیس ودبیر) سے لے کر اس طرح یکجا کر دیا جائے کہ کسی کلام کے عام محاسن اور خاص طور سے شاعری کی حقیقت اوراس کے جانچنے کے اصول ومعیار طلبہ کے ذہن نشین ہو جائیں۔

ہماری زبان میں اس قسم کی تنقیدی کتاب اصولی حیثیت سے تھی بھی نہیں،اس لئے اس انتخاب نے یہ کمی بھی پوری کر دی۔''

(انتخابات شبلی،ص:۱)

انتخابات شبلی نے بڑی مقبولیت پائی۔۸۲/سال پہلے جوانتخاب شائع ہوا تھا وہ آج بھی طبع ہو رہا ہے اور مقبول ومتداول ہے۔لیکن اب یہ معلوم نہیں کہ یہ انتخاب مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے یا نہیں۔البتہ اب وہاں مطالعہ شبلی ایک مستقل موضوع ہے اوراس کی باقاعدہ تدریس ہوتی ہے۔

گذشتہ دنوں اتفاقاً ''انتخابات شبلی'' کے ایک خلاصہ پر نظر پڑی، جسے آقائے رازی نے کیا ہے اور ایم فرمان علی بک سیلر پبلشر موہن لال روڈ لاہور نے شائع کیا ہے۔کوآپریٹیو کیپٹل پرنٹنگ پریس لاہور میں طبع ہوا ہے۔سنہ اشاعت درج نہیں ہے اور نہ ہی پیش لفظ وغیرہ لکھا گیا ہے۔ پونے دوسوصفحات کی کتاب کا خلاصہ ۶۲/صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔تمام اہم عنوانات باقی رکھے گئے ہیں بلکہ مصنف کی اصل عبارت ہو بہو باقی رکھی گئی ہے، تلخیص نگار نے اپنے لحاظ سے جس عبارت کو غیرضروری خیال کیا ہے اسے حذف کر دیا ہے۔یہ کس قدر تعجب خیز ہے کہ ''انتخابات شبلی'' کا بھی انتخاب شائع کیا گیا۔سب کے ایسے نصیب کہاں۔؟

انتخاب رسائل شبلی

اردو زبان میں تاریخی مقالہ نگاری کے آغاز کا سہرا علامہ شبلی کے سر ہے۔وہ فروری ۱۸۸۳ء میں جب ایم اے او کالج علی گڑھ سے وابستہ ہوئے تو سرسید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء)

کی رفاقت ،ان کے کتب خانے سے استفادہ اور پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ کی دوستی کے ذریعہ وہ یورپ کے ان افکاروخیالات سے واقف ہوئے جو وہ مسلمانوں کے بارے میں روا رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ،المامون،سیرۃالنعمان اورالفاروق جیسی مستقل تصانیف کے ساتھ الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ اورحقوق الذمیین جیسے متعدد تحقیقی اورتاریخی مقالات لکھے اورمسلمانوں پر یورپ کے متعدد الزامات کی تردیدکی۔۱۸۹۸ءتک اس نوع کے دسیوں مقالات ان کے قلم سے نکل کرمقبول ہو چکے تھے۔۱۸۹۸ء میں ''رسائل شبلی'' کے نام سے ان تاریخی مقالات کا ایک مجموعہ خودعلامہ شبلی نے مرتب کیا جس میں گیارہ تاریخی مقالات شامل ہیں اور جسے ملک کے متعدداشاعتی اداروں نے شائع کیا۔۱۹۶۲ء میں ایوان اردو پٹنہ نے ''رسائل شبلی'' کا بھی ایک انتخاب شائع کیا۔اس میں ''رسائل شبلی'' کے سات مقالات شامل ہیں:

۱۔اسلامی حکومتیں اور شفاخانے

۲۔اسلامی کتب خانے

۳۔حقوق الذمیین

۴۔الجزیہ

۵۔میکنکس اورمسلمان

۶۔خطبہ

۷۔اسلامی مدارس اوردارالعلوم

ایوان اردو پٹنہ۴ نے اسے شائع کیا ہے۔اس کے سول ایجنٹ موتی لال بنارسی داس کتب فروش بانکی پور پٹنہ ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی کے علمی وادبی مقالات کے متعدد مجموعے دہلی،لکھنو،لاہوراورامرت سر سے شائع ہوئے اوروں کے علاوہ ان کے شاگرد رشیداور جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے ۸؍جلدوں میں ان کے مقالات شائع کئے،لیکن ''رسائل شبلی'' واحد مجموعہ ہے جسے خود مقالہ نگار یعنی علامہ شبلی نے مرتب کر کے شائع کیا۔ یہ بڑی بات ہے کہ اس کا بھی انتخاب شائع کیا گیا۔واقعہ یہ

ہے کہ ہماری ادبی تاریخ میں شاید ہی ایسا ہوا ہو کہ کسی کے مجموعہ مقالات کا بھی انتخاب کیا گیا ہو۔

رسائل شبلی کے متعدد ایڈیشن ملک و بیرون سے شائع ہوئے۔ ان کا فارسی میں ایران سے ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔ ۲۰۱۴ء میں شبلی صدی کے موقع پر دارالمصنّفین نے اس کا بڑا شاندار ایڈیشن شائع کیا ہے۔

حالی، شبلی اور آزاد (تحقیق کے آئینے میں)

یہ ڈاکٹر چمن لعل بھگت کی تصنیف ہے۔ ۲۰۰۸ء میں میزان پبلشرز سری نگر کشمیر سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت ۲۵۰/روپئے ہے۔ مختلف ابواب میں تینوں بزرگ ادیبوں کی حیات و خدمات کی تفصیلات یکجا کی گئی ہیں۔ مصنف نے لکھا ہے کہ

> ''حالی شبلی اور آزاد ابتدائی ادبی شہسوار ہیں، جنہوں نے اردو شعروادب سے ابتدائی مرحلے کا سنگ بنیاد رکھنے کے ساتھ بام عروج تک لے جانے میں کلیدی رول نبھایا۔ اگر چہ حالی، شبلی اور آزاد پر کافی کتابیں لکھی و مرتب کی جا چکی ہیں لیکن کوئی ایسی جامع کتاب سامنے نہیں آئی جس میں ان تینوں ہستیوں کے بارے میں مفصل جانکاری ہو سکے۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے حالی، شبلی اور آزاد تحقیق کے آئینے میں کے نام سے کتاب شائع کرنے کا من بنایا ہے۔'' (ص:۱۳)

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتاب کی زبان کیسی اور کس معیار و سطح کی ہے۔

اردو مرثیے کی تنقید میں موازنہ انیس و دبیر کی اہمیت

ڈاکٹر ریاض الہاشم نے یہ کتاب لکھی ہے جسے ۲۰۱۵ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

دہلی نے شائع کیا ہے۔اس میں علامہ شبلی کے سوانحی خاکہ کے علاوہ تین ابواب ہیں:

باب اول:شبلی نعمانی کی شخصیت اور تہذیبی پس منظر

باب دوم:اردو میں عملی تنقید اور موازنہ انیس ودبیر

باب سوم:اردو تنقید پر موازنہ کے اثرات اور محاصل

آخر میں مراثیے انیس دئے گئے ہیں۔

مصنف نے محنت کی ہے اور کتاب اور تحقیق وتنقید کا حق ادا کرنے کی کوشش ہے۔

عطیہ شبلی

نامور عالم ،مصنف ومحقق اور ماہر غالبیات مولانا امتیاز علی خاں عرشی[۱۹۰۵-۱۹۸۱ء] کے صاحبزادے جناب اکبرعلی خاں عرشی زادہ(۱۹۴۰-۱۹۹۷ء)ممتاز ادیب،شاعر اور محقق ونقاد تھے۔اپنے والد کی طرح ماہر غالبیات تھے۔فارسی کے بھی زبردست اسکالر تھے۔انہوں نے متعدد علمی وادبی کارنامے انجام دئے۔وہ علامہ شبلی کے شیدائیوں میں بھی تھے۔۱۹۷۸ء میں ماہنامہ تحریک دہلی کے سلور جبلی نمبر کے لئے انہوں نے علامہ شبلی کے مجموعہ غزلیات دستہ گل، بوئے گل اور برگ گل کی ۲۶ منتخب فارسی غزلوں اور ایک خیر مقدم کا منظوم اردو ترجمہ کیا۔یہ علامہ شبلی کو اپنی نوعیت کا ایک انوکھا خراج عقیدت تھا۔ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے ایک خط میں اس کی تحسین و ستائش کی اور لکھا کہ

> ''شبلی کا ترجمہ آپ نے اسی کیفیت میں کیا ہے جو اصل کلام میں ہے۔آپ کی شخصیت میں بھی وہی رومانیت موجود ہے،جس کی وجہ سے شبلی بدنام رہے۔خیران کو تو عالم دین ہونے کی لاج رکھنی تھی ،آپ تو اس رومانیت کو زندہ رکھیں۔آپ کی تحریروں میں جان اسی وجہ سے ہے۔''
>
> (ماہنامہ تحریک دہلی سلور جبلی نمبر،ص:۵۹۸)

فارسی غزلوں کا یہی منظوم ترجمہ ''عطیہ شبلی'' کے نام سے ماہنامہ تحریک دہلی کے سلور جبلی نمبر میں شائع ہوا تھا اور اسی کو ان کے صاحبزادے ڈاکٹر ممتاز عرشی نے کتابی صورت میں ۲۰۲۰ء میں شائع کیا ہے جو راقم کو ابھی حال میں دستیاب ہوا ہے۔۲۴۲ر صفحات پر مشتمل یہ کتاب مولانا عرشی میموریل سوسائٹی رام پور سے ۳۰۰ر روپئے میں حاصل کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر ممتاز عرشی اور ان کی ہم شیرہ ڈاکٹر زہرہ عرشی مرحومہ کے پیش لفظ سے شاعر و مترجم کے بارے میں متنوع معلومات درج ہیں۔البتہ مرتب نے لکھا ہے کہ انہیں 'کلیات شبلی' دستیاب نہیں ہوا۔اس پر سوائے اظہار تعجب کے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔اس لئے کہ اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور تقریباً تمام کتب خانوں میں دستیاب ہے۔دارالمصنّفین اعظم گڑھ اور ملک کے بعض دوسرے مکتبات پر برائے فروخت بھی دستیاب ہے۔ڈاکٹر ممتاز عرشی نے علامہ شبلی کی تاریخ پیدائش بھی (۳۰ر جون ۱۸۵۷ء) غلط درج کی ہے۔صحیح ۴ر جون ۱۸۵۷ء ہے۔خدا جانے یہ تساہلی کیوں کر ہوئی۔؟

دوکوزہ گر(شبلی نعمانی اور ظفر علی خاں)

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ظفر علی خاں ایم اے او کالج علی گڑھ میں استاد و شاگرد تھے۔ ان دونوں شخصیات کے طویل المدت تعلقات اور افادہ واستفادہ کے ذکر پر مشتمل ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب (پروفیسر وڈائرکٹر ادارہ زبان وادبیات اردو اورینٹل کالج لاہور) نے مذکورہ تحقیقی کتاب لکھی ہے اور مجھے تحفتاً بھیجی ہے۔۲۰۰ر صفحات پر مشتمل اس کتاب میں موضوع کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

پروفیسر موصوف کے مطالعہ وتصنیف کا ایک اہم موضوع ان کا سلسلہ ''ظفریات'' ہے۔مولانا ظفر علی خاں کی سیرت وشخصیت کا انہوں نے بڑی گہرائی اور دقت نظری سے مطالعہ کیا ہے۔اور چار کتابیں لکھی یا مرتب کی ہیں۔ان کے نام یہ ہیں: مکاتیب ظفر علی خاں، مولانا ظفر علی خاں کتابیات، کلیات نثر ظفر علی خاں، خطوط وخیوط ظفر علی خاں۔

ان کے علاوہ اتنی ہی کتابیں ان کی زیرنگرانی مولانا ظفرعلی خاں سے متعلق مرتب ہوئی ہیں۔ان کے نام یہ ہیں: مولانا ظفرعلی خاں کی آپ بیتی، اشاریہ کلیات ظفرعلی خاں، کلیات ظفرعلی خاں کا موضوعاتی اشاریہ، کلیات ظفرعلی خاں کا عروضی اور ہیئتی مطالعہ۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی عمر گذری ہے اسی دشت سیاحی میں۔یہی وجہ ہے کہ زیرنظر کتاب میں شبلی نعمانی وظفرعلی خاں کے تعلقات، توقیت، ایک دوسرے سے متعلق تحریریں اور منظومات ومراسلات وغیرہ کو ان رسائل سے جن سے یہ دونوں بزرگ وابستہ رہے ایک ایک چیز تلاش کرکے یکجا پیش کردی ہیں۔نہ صرف تحقیقی بلکہ نظریاتی لحاظ سے بھی بحثیں کی ہیں اور دکھایا ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں مدۃ العمر ایک دوسرے کے ہمدرد وبہی خواہ اور معاون رہے۔اور اگر کسی قسم کا اختلاف بھی ہوا تو وہ محض ضمنی تھا اور اس کی کوئی خاص حیثیت نہیں رہی۔ اپنے موضوع پر ایک بہترین کتاب ہے۔اس کا مطالعہ نہ صرف مولانا ظفرعلی خاں کے بلکہ شبلیات کے حوالہ سے بھی افادیت کا حامل ہے۔

خیال وفن، لاہور (شبلی نمبر)

سہ ماہی رسالہ ''خیال وفن'' لاہور نے شبلی صدی کی مناسبت سے ۲۰۱۵ء میں شبلی نمبر شائع کیا تھا۔ مجھے اس کا علم تھا، مگر ہند وپاک کے درمیان ڈاک کا نظام ختم ہونے کے سبب اسے حاصل کرنے میں خاصا وقت لگ گیا۔اور اب ملا بھی تو اصل کے بجائے پی ڈی ایف فائل ہاتھ آئی ہے، جسے دیکھا جاسکتا ہے گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا جاسکتا۔۱۳۸رصفحات پر مشتمل اس نمبر میں علامہ شبلی سے متعلق ۱۱رتحریریں شامل ہیں۔

۱۔اداریہ عظمت شبلی	مدیر اعلی
۲۔علامہ شبلی کے ماہ وسال	ممتاز راشد لاہوری
۳۔علامہ شبلی کی کتاب سیرۃ النعمان	سرسید احمد خاں
۴۔علامہ شبلی کی کتاب الفاروق	سید محمد عبداللہ

۵۔شبلی ایک نئی دنیا میں	جاذب قریشی۔لاہور
۶۔شبلی کی قطعہ نگاری	پروفیسر شہپر رسول،نئی دہلی
۷۔علامہ شبلی اور عطیہ فیضی	ممتاز راشد لاہوری
۸۔شبلی کا شعری سرمایہ	ممتاز راشد لاہوری
۹۔علامہ شبلی سرسید کے تھیٹر میں	اسلام عظمی
۱۰۔شبلی سمینار اور متصلہ مشاعرے	ادارہ
۱۱۔صحیفہ کے شبلی نمبر پر ایک نظر	ڈاکٹر امجد طفیل،ممتاز راشد لاہوری

نئی پرانی تحریروں کو یکجا کر کے ایک عمدہ نمبر نکالنے کی کوشش کی گئی ہے،مگر کامیابی نہیں ملی۔بیشتر تحریریں متعدد بار چھپ چکی ہیں۔

ooo

[۳]

تصانیف شبلی اوران کے جوابات

(توضیحی اشاریہ)

علامہ شبلی مصنف نہیں رئیس المصنّفین تھے۔ان کی تصنیفات وتالیفات ان کی زندگی میں بھی مقبول ہوئیں اور بعد میں اور بھی شہرت ومقبولیت کے آسمان پر چمکیں۔ان کے جس قدر ایڈیشن طبع ہوئے،اور جس قدر تلخیصات ہوئیں اور جس قدر تراجم شائع ہوئے ہماری زبان میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ملک وبیرون سے طبع ایڈیشن کا شمار کرنا مشکل ہے،البتہ تراجم کا مستقل طور پر راقم نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اب تک ۱۸؍زبانوں میں ۱۴۲؍تراجم دنیا بھر سے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔

علامہ کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کے وجود میں آنے سے پہلے ان کا غلغلہ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک بلند ہوا۔اور مشتاقان علم ونظر ان کے منتظر رہے۔اسی طرح ان کی تقریباً تمام کتابوں کے جواب میں مضامین ومقالات کے علاوہ مستقل تنقیدی اور مخالفانہ کتابیں لکھی گئیں جن سے علی العموم اہل علم بھی واقف نہیں ہیں۔یہاں علامہ کی تصنیفات کے ساتھ ان کے جواب میں لکھی جانے والی کتابوں کا ایک توضیحی اشاریہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔اسکات المعتدی علی انصات المقتدی

اسکات المعتدی علی انصات المقتدی،صفحات ۲۴۔نظامی پریس کان پور،محرم ۱۲۹۸ھ مطابق دسمبر ۱۸۸۰ء،باہتمام محمد عبدالرحمٰن بن الحاج محمد روشن خاں۔

اس رسالہ میں علامہ شبلی نے ثابت کیا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت فاتحہ نہ صرف یہ کہ

واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے۔خواہ نماز جہری ہو یا سری۔ دونوں حالتوں میں مقتدی کو خاموش رہنا ہے۔اپنے موقف کی تائید میں علامہ شبلی نے قرآن مجید کی یہ آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا. پیش کی ہے اوراس سے یہ استدلال کیا ہے کہ مطلوب قرآن کا سننا اورخاموش رہنا ہے۔قرآن کا سننا تو جہری نمازوں ہی میں ممکن ہے،سری میں نہیں اور خاموش رہنا دونوں میں ممکن ہے۔علامہ شبلی نے اپنے موقف کی تائید میں قدمائے حنفیہ کے متعدد دلائل کا بھی احاطہ کیا ہے۔

قرأت فاتحہ خلف الامام کی اصل بحث سے پہلے علامہ شبلی نے سنت رسولؐ کی اہمیت بیان کی ہے، پھر صحابۂ کرامؓ اورفقہائے عظام کی خدمات کاتفصیل سے ذکر بھی کیا ہے۔

اس کتاب کے درج ذیل جوابات لکھے گئے ہیں:

جواب:۱۔ تذکرۃالمنتھی فی رداسکات المعتدی،مولانا نورمحمد ملتانی،

جواب: ۲۔الافادات فی رداسکات

جواب: ۳۔ التنبیھات علی ھفوات الاسکات

جواب: ۴۔ الایماضات الی اغلاط مصنف الاسکات۔حافظ ملاشعیب حنفی، کابلی، باجوری،مطبوعہ انوارمحمدی لکھنو،۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء

جواب: ۵۔ الکلام حاشیہ غیث الغمام ۔مولانا عبدالحی فرنگی محلی ،مطبع علوی لکھنو،۱۳۰۳ھ/۸۶-۱۸۸۵ء

۲۔ظل الغمام

ظل الغمام فی مسئلة القراۃ خلف الامام۔مطبع نظامی کان پور،طبع اول:۱۲۹۹ھ، ص:۴۰

اس کا موضوع بھی قرات فاتحہ خلف الامام ہی ہے۔

اس کے درج ذیل جوابات لکھے گئے:

جواب:۱۔میزان الحق ۔مولانا سلامت اللہ جیراج پوری،

جواب: ۲۔ضرب الخیام فی الرد علی ظل الغمام۔
جواب:۳۔ تحقیق الکلام فی وجوب القراۃ خلف الامام
مولفہ: مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری،

۳۔المامون

المامون۔انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۸۸۷ء، ص۱۸۴
اس میں علامہ شبلی نے خلیفہ مامون رشید کے حالات اور کارنامے، اور اس کے عہد کی تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔اس کا ایک جواب لکھا گیا ہے:

جواب :۱۔ریویوالمامون۔(ایک مسلمان) مطبوعہ اودھ پریس لکھنو،۱۸۹۳ء، ص۱۷

۴۔سیرۃ النعمان

سیرۃ النعمان، مطبع مفید عام آگرہ، طبع اول ۱۸۸۹ء، ص۳۱۰
امام اعظم ابوحنیفہ کے حالات وسوانح اور ان کے فقہی اجتہادات کی تفصیل قلم بند کی گئی ہے۔ یہ اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔اس کے درج ذیل جوابات لکھے گئے ہیں:

جواب: ۱۔حسن البیان فی مافی سیرۃ النعمان۔مولانا محمد عبدالعزیز رحیم آبادی

تعارف:

''اس کتاب میں حدیث اور اصول حدیث اور سیرۃ محدثین کے متعلق بحثیں ہیں اور ان اعتراضوں کے جواب ہیں جو مولوی شبلی نعمانی نے علم حدیث اور ائمہ حدیث پر کئے ہیں۔اور اس موازنہ کی غلطی کا اظہار ہے جو انہوں نے حدیث اور فقہ کو ہم پلہ قرار دیا ہے اور مدح امام ابوحنیفہ کے مبالغہ میں محدثین کی اہانت کی ہے اور ان مسائل حدیثیہ وکلامیہ کی بھی تحقیق ہے جن پر امام

ابوحنیفہ کی نصرت میں نعمانی صاحب نے ردوقدح کی ہے۔''

مطبع فاروقی دہلی، ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء، ص ۲۳۶

جواب: ۲۔ ریویو کتاب سیرۃ النعمان پر، قزلباش، مطبوعہ اودھ پریس نخاس لکھنو ۱۸۹۳ء، ص ۳۲+۳۶=۶۸

اس میں سیرۃ النعمان پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اس کی کمیاں دکھائی گئی ہیں۔ نیز اخبار نظام الملک مراد آباد کے معترضانہ ریمارک اور اس پر قزلباش کی آرا نقل کی گئی ہیں۔

جواب: ۳۔ **الارشاد الی سبیل الرشاد فی امر التقلید والاجتهاد** ۔ مولانا حکیم ابویحییٰ محمد، شاہ جہاں پوری، ثنائی برقی پریس امرت سر، ماہ رجب المرجب ۱۳۵۲ھ، مطابق اکتوبر ۱۹۳۳ء، ص ۱۶۲

موضوع تقلید و اجتہاد ہے، تقلید کی تاریخ، اہل تقلید اور حدیث کے طرز عمل کا موازنہ کیا گیا ہے۔ معترضین کے اعتراضات کا جواب اور محدثین کی خدمات کی تفصیل ہے، علامہ شبلی اور ان کی سیرۃ النعمان پر بھی متعدد اعتراضات وارد کئے گئے ہیں۔

جواب: ۴۔ تذکرہ امام ابوحنیفہ۔ صاحبزادہ احمد شرق پوری، پروگریسیو بکس لاہور، ۱۹۹۹ء۔ یہ کتاب راقم کی نظر سے نہیں گذری ہے۔

۵۔ الفاروق

الفاروق۔ مطبع نامی کان پور، ۱۸۹۹ء

خلیفہ سوم حضرت عمرؓ فاروق اعظم کی سوانح عمری، دنیا بھر میں مشہور ہے۔

جواب: ۱۔ حضرت عمرؓ (حصہ اول)۔ مولانا سید علی حیدر، اصلاح پریس کھجوہ ضلع سارن، ۱۹۶۱ء، ص ۲۰۸

الفاروق اور اس کے مصنف پر متعدد اعتراضات وارد کئے ہیں اور کمیاں دکھلائی ہیں۔

جواب: ۲۔ الفرق (حصہ اول و دوم) مرزا عابد علی بیگ قزلباش، مطبوعہ برلاس

مرادآباد حصہ اول ۱۹۰۵ء، حصہ دوم ۱۹۰۷ء، ص ۶۷۲

الفاروق کے دونوں جوابات شیعہ فرقہ کے علماء لکھے ہیں۔ اور وہی اعتراضات وارد کئے ہیں جو وہ فاروق اعظمؓ کی ذات گرامی پر کرتے رہے ہیں۔ البتہ اس کتاب میں علامہ شبلیؒ پر بھی متعدد اعتراضات کئے ہیں۔

۶۔ الکلام

الکلام۔ مطبع نامی کان پور، ۱۹۰۴ء، ص ۳۱۰

یعنی جدید علم کلام جس میں اسلامی عقائد کو فلسفہ حال کے مقابلہ میں ثابت کیا گیا ہے۔

جواب: ا۔ علامہ آخر الزماں۔ مولوی محمد عماد الدین شیرکوٹی، مدرس اول مدرسہ خازن العلوم خورجہ، مطبع قاسمی دیوبند ۱۳۳۲ء باہتمام مولانا حبیب الرحمٰن۔ ص: ۱۶

علامہ شبلیؒ نے الکلام اور علم الکلام میں عقائد پر جو بحث وجرح کی ہے، ان کے بعض خیالات پر نقد کیا گیا ہے۔ اور اسے اسلام کے خلاف قرار دیا گیا ہے۔ دراصل یہ وہ رسالہ ہے جو دارالعلوم ندوہ میں آپسی تنازعات میں علامہ شبلیؒ کو زیر کرنے کے لئے شائع کیا گیا تھا۔ (ص: ۴)

۷۔ موازنہ انیس و دبیر

مطبوعہ: مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۰۷ء، ص ۲۸۵

میر انیس کی شاعری پر تفصیلی ریویو اور میر انیس و مرزا دبیر کا موازنہ

اس کتاب کے درج ذیل جوابات لکھے گئے:

جواب: ا۔ ردالموازنہ، میر افضل علی ضوؔ، مطبع تصویر عالم، لکھنو، ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء، ص: ۷۲

اس میں جیسا کہ نام سے واضح ہے موازنہ انیس و دبیر کے مباحث کا رد لکھا گیا ہے۔ اور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرزا دبیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔

جواب: ۲۔تردیدالموازنہ،حسن رضاومحمد جان عروج،مطبع تصور عالم لکھنو،ص۲۰۶

علامہ شبلی اورموازنہ کے بیانات کی تردید کی گئی ہے۔

جواب: ۳۔المیز ان،

''یعنی مولوی شبلی نعمانی کی کتاب موازنہ انیس ودبیر پرمحققانہ اور منصفانہ ریویواورمرزادبیرکے ہرقسم کے فصیح وبلیغ اورصاف وسلیس کلام کا نمونہ اورمیرانیس ومرزادبیر پراعتراضات کے مدلل ومفصل جوابات''

مولفہ:سیدنظیرالحسن فوق رضوی،رئیس مہابن ضلع متھرا،مطبع فیض عام علی گڑھ،۱۹۱۴ء، ص:۶۱۰

جواب: ۴۔عربی مرثیہ کی مختصرتاریخ،سیدسبط الحسن فاضل ہنسوی،امامیہ مشن لکھنو، ص:۹۶

موازنہ انیس ودبیرمیں علامہ شبلی نے ایک جملہ میں عربی مرثیہ کاضمناً ذکرکردیاہے۔ مشہورشیعہ عالم وادیب سیدسبط الحسن فاضل ہنسوی نے اسے موازنہ اورعلامہ شبلی کی ایک کمی بتاکر یہ کتاب''عربی مرثیہ کی مختصرتاریخ''لکھی ہے۔

جواب: ۵۔حیات دبیر(دوحصے)

مولفہ:سیدافضل حسین ثابت رضوی لکھنوی۔جارج سٹیم پریس لاہور،طبع اول ۱۹۱۵

اشتہار:''(۱)جس میں حضرت دبیر کےصحیح حالات ہیں۔(۲)حضرت دبیر کے معاصرین اہل علم وشعراکے حالات درج ہیں۔(۳) کلام دبیرکے مقابلہ میں کلام شعرااردو،فارسی،عربی وطرزتحریر،کلام بعض شعرائے یورپ۔ (۴)صنائع وبدائع شاعری معلوم ہونے کی ضرورت۔(۵)ہرقسم کی سلیس و فصیح ودقیق وبلیغ وسہل ممتنع نظم۔(۶)مولوی شبلی صاحب کےاعتراضات، وجہ موازنہ کی تردید۔(۷)لکھنوکےشاہی زمانہ کی مجالس کی کیفیت کانظارہ۔ (۸)ایشیائی شاعری کے ہرقسم کےنمونے۔(۹)اردوزبان سے واقفیت،

غرض عجب دلچسپ کتاب ہے۔''

۸۔شعرالعجم

شعرالعجم (اول تا چہارم) مطبوعہ فیض عام علی گڑھ،علی الترتیب:۱۹۰۹ء،۱۹۱۰ء،۱۹۱۰ء،
ص۱۹۱۲ء(صفحات:۳۵۶،۳۰۲،۲۳۰،۳۴۰)

اردوزبان میں فارسی شاعری کی تاریخ وتنقیداورتشریح اورعہد بہ عہد کاارتقاءوجائزہ اور شعرائے فارسی کے تذکرہ،اوران کی شاعری پرتبصرہ کیا گیاہے۔اپنے موضوع پر بےنظیر کتاب۔

جواب: ا۔تنقید شعرالعجم،حافظ محمود شیرانی،انجمن ترقی اردو ہند،۱۹۴۲ء،ص۶۱۰

اس میں بقول مصنف شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کے مشہور تذکرے شعرالعجم کے تاریخی بیانات پرتحقیق کی روشنی میں نقد وتبصرہ کیا گیاہے۔

۹۔سیرۃ النبیؐ(اول ودوم)

مطبع نامی پریس کان پور،۱۹۱۸ء و۱۹۲۰ء

حصہ اول: سوانح اقدس حضرت سرورعالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔از ولادت تاختم سلسلہ غزوات مع مقدمہ نقد وفن سیرت وتاریخ عرب قبل ظہور وبعثت

حصہ دوم: از سنہ۹رہجری تا۱۱رہجری جس میں اقامت امن،تاسیس خلافت ، اشاعت اسلام ، انتظامات مذہبی،تکمیل شریعت، حجۃ الوداع، وفات،شمائل،اخلاق وعادات کی تفصیل اورازواج واولاد کامختصر تذکرہ ہے۔

سیرت النبیؐ کے درج ذیل جوابات لکھے گئے:

جـــــواب: ا۔اسوۃ الرسول(سوانح حیات مقدسہ حضرت سیدالمرسلین خاتم النبیین رسول اکرم محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم)۔(اول تا چہارم) خان بہادرسیداولا دحیدرفوق بلگرامی

نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنو، ۱۳۴۷ھ

حصہ اول: از آغاز حالات عرب قدیم تا عہد حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب

حصہ دوم: از آغاز حالات ولادت باسعادت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)

تا واقعات پنجم سال ہجرت

حصہ سوم: آغاز واقعات سال ششم سال ہجرت تا حالات وفات حسرت آیات

جـــــواب: ۲۔مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار۔ظفر احمد صدیقی، دارالنوادر، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:۳۰۴

علامہ شبلی پر خود ان کے وضع کردہ اصول سیرت نگاری سے منحرف ہونے کا الزام اور اس کی متعدد مثالیں۔نیز قوی دلائل کے بجائے ضعیف شواہد سے استدلال کی مثالیں درج کی گئی ہیں۔

جواب: ۳۔فتنہ شبلی۔سید اختر حسین، درمطبع اصلاح کھجوہ ضلع سارن، ص:۱۱۲

تعارف بقلم مصنف:

''مولوی شبلی صاحب نعمانی نے سیرۃ النبی جلد دوم ص ۱۱۳ میں اس کا دعویٰ کیا تھا کہ معاذ اللہ جناب امیر نے بحالت نشہ نماز پڑھائی اور اس میں سورہ ''**قل یاایھاالکافرون**'' کو غلط پڑھا،اسی روایت کی تحقیق اس رسالہ میں کی گئی ہے۔جس سے حق واضح ہو اور معلوم ہو کہ صرف عیب پوشی شر بخواری خلفا کے لئے اس قسم کا الزام رسول مقبول پر بھی کیا گیا ہے،معاذ اللہ امید کہ ناظرین اس رسالہ کو بغور دیکھیں گے۔**واللہ یھدی من یشاء الی صراط المستقیم**۔(سرورق)

جواب: ۵۔ **التکمیل**۔مولانا مرتضیٰ حسین،(مزید تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں۔)

جواب: ٦۔ **البحث القوی عن سیرۃ النبیؐ**۔ابوالمکارم محمد علی،شمس المطابع لکھنو، اکتوبر ۱۹۲۵ء۔ο

[۴]

اثراتِ شبلی

ناچیز کی تصنیف کتاب ''اثراتِ شبلی'' کی دونوں جلدیں اسی سال ادبی دائرہ اعظم گڑھ کی جانب سے ایک ساتھ شائع ہوئی ہیں اور الحمدللہ بے حد پسند کی جارہی ہیں۔اب ان کا دوسرا ایڈیشن ورلڈ ویو پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔

اثراتِ شبلی کی نشاندہی کا آغاز سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) سے ہوا ہے اور اب تک یہ سلسلہ ہنوز قائم ہے۔اس طویل مدت کے ۲۰۹؍نامور اور ممتاز اشخاص کا مطالعہ ''اثراتِ شبلی'' کی دونوں جلدوں میں آیا ہے۔ یہ مطالعہ و جائزہ اس قدر محنت اور تلاش و تفحص سے لیا گیا تھا کہ یقین کامل تھا کہ اب کوئی اور شخص متاثرینِ شبلی میں سے نہ ملے گا،مگر کیا کہا جائے کہ اس طرح کے یقین ٹوٹنے ہی کے لئے قائم ہوتے ہیں۔چنانچہ ''اثراتِ شبلی'' کی اشاعت کے بعد جو کچھ ہاتھ آیا اسے قارئین بیانِ شبلی حصہ سوم کی نذر کیا جاتا ہے۔

---

(۱)

پنڈت منوہر لال زتشی

[۱۸۷۶-۱۹۴۴ء]

پنڈت منوہر لال زتشی اردو و انگریزی کے ایک ممتاز اہلِ قلم اور مصنف و مولف تھے۔ ان کے قلم سے اردو و انگریزی میں کئی کتابیں نکلیں۔اردو میں ''کبیر صاحب'' اور ایک درسی کتاب

''گلدستہ ادب'' ان کی یادگار ہیں۔

پنڈت منوہر لال زتشی ۱۸۷۶ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ کیننگ کالج لکھنو سے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی۔۱۸۹۴ء میں بی اے کرنے کے بعد ایم اے بھی کیا۔تحصیل علم کے بعد مختلف سرکاری مناصب پر کام کئے۔ پہلے ٹریننگ کالج الہ آباد کے پرنسپل، گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ جہاں پور میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ بعدازاں انسپکٹر آف اسکول اور بی ایچ یو بنارس میں رجسٹرار بنائے گئے۔۴ر مئی ۱۹۴۴ء کو انتقال کیا۔

پنڈت منوہر لال زتشی علامہ شبلی سے بخوبی واقف تھے۔ان کا تذکرہ لکھنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی سے اردو نثر میں اکثر تصانیف یادگار ہیں۔الفاروق، المامون، الغزالی، الجزیہ، رسائل شبلی، خاص کر اسلامی مضامین سے متعلق ہیں اور ان سے آپ کے تاریخی ذوق وتحقیقات کا پتہ چلتا ہے۔ان کے علاوہ سفرنامہ روم ومصروشام، سوانح مولانا روم، موازنہ انیس ودبیر، شعر العجم ایسی کتابیں ہیں جن سے ہر مذہب وملت کے لوگ یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔مولانا شبلی ان معدودے چند مصنّفین میں ہیں جنہوں نے کریٹی سزم کے اصلی مفہوم کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تنقید کا حق اردو میں بھی ادا کیا جائے۔ آپ کا طرز تحریر سلیس پرزور اور دلپذیر ہے۔شعر اردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے اردو نظم میں مثنوی صبح امید آپ سے یادگار ہے۔''
>
> (گلدستہ ادب، ص ۱۲۷)

پنڈت منوہر لال زتشی جس زمانہ میں درسی کتاب'' گلدستہ ادب'' تیار کر رہے تھے انہوں نے علامہ شبلی نعمانی سے رابطہ کیا اور ان کی تصانیف سے انتخاب کی اجازت چاہی۔ پنڈت زتشی صاحب لکھتے ہیں کہ

> ''میں ان سب بزرگوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے نہایت

دریادلی سے مجھ کو اپنی تصانیف سے یا ایسی تصانیف سے جوان کے قبضہ میں تھیں انتخاب کرنے کی اجازت دی۔

حضرت شبلی نعمانی کا میں خصوصاً شکرگذار ہوں۔ جناب ممدوح نے نہ صرف اپنی شائع شدہ تصانیف سے انتخاب کرنے کی اجازت دی بلکہ شعرالعجم کی چوتھی جلد شائع ہونے کے قبل اس کا پروف مجھ کو بھیج دیا اور اس میں سے جو مضامین میں چاہتا تھا ان کو اخذ کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔

(ایضاً، ص:۲)

---

(۲)

مولانا سید سلیمان ندوی

[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء]

''اثرات شبلی'' حصہ اول میں مولانا سید سلیمان ندوی کا ذکر قدرے تفصیل سے آچکا ہے، مگر ان کا ایک بڑا اہم مضمون ماہنامہ معارف میں ''جن سے میں متاثر ہوا'' (جولائی ۱۹۵۰ء) کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کا ذکر اثرات شبلی میں نہیں آسکا ہے۔ دراصل وہ مضمون راقم کی نظر سے نہیں گذرا تھا۔ اس کے دو طویل اور اہم اقتباسات کا نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''میرا سیاسی ذوق بھی مولانا شبلی مرحوم کا فیض ہے۔ وہ اٹھارہ (صحیح ۱۶) برس سرسید کے ساتھ رہنے کے باوجود ان کے سیاسی خیالات کے سخت مخالف تھے۔'' (معارف، جولائی ۱۹۵۰ء، ص:۹)

''سب جانتے ہیں کہ میرا تصنیفی ذوق مولانا شبلی کی تربیت کے دامن میں پرورش پایا ہے۔ استاد مرحوم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نوآموزوں کو پہلے

مضمون لکھنے کی ہدایت کرتے تھے۔کبھی وہ عنوان خود بتاتے تھے اور کبھی طالب علم خود ہی مقرر کر لیتے تھے۔ پھر وہ اس مضمون کے متعلق معلومات کا سراغ کتابوں میں بتاتے تھے۔ طالب علم اپنی محنت سے ان کا کھوج لگاتے تھے۔اور جب کافی معلومات جمع ہو جاتے تو ان کو لکھ کر ان کے سامنے پیش کرتے۔ وہ اس میں کاٹ چھانٹ کرتے۔مضمون کے بعد پھر رسالوں کی اور اس کے بعد کتابوں کی تصنیف کی باری آتی۔ تاکید ہوتی کہ معلومات اور مواد کو ہر کونہ اور گوشہ اس محنت سے ڈھونڈو کہ پھر کوئی کونہ خالی نہ رہ جائے۔ اس عنوان پر اگر پہلے کسی نے لکھا ہو تو اس سے تمہارا مضمون بالکل الگ رہے، یا اس سے بڑھ جائے۔مستند حوالہ کے بغیر کوئی واقعہ نقل نہ کیا جائے۔ حوالہ میں سب سے قدیم اور سب سے مستند ماخذ کا خیال رکھا جائے۔معنی کے ساتھ عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی اور تشبیہ واستعارہ کی ندرت ہاتھ سے نہ جائے۔ پامال معلومات، مبتذل محاورات اور عامیانہ الفاظ سے پوری طرح پرہیز کیا جائے۔ یہ ان کا طریقہ تھا اور اسی طریقہ کی پابندی ہمارے دارالمصنّفین میں جس میں علماء اور گریجویٹ اصحاب کو تصنیف و تالیف کی تعلیم دی جاتی ہے، اب تک کی جاتی ہے۔''

(معارف، جولائی ۱۹۵۰ء، ص:۱۲)

---

(۳)

میجر شمس الدین محمد

[۱۹۰۶-۱۹۶۸ء]

ریاست بہاول پور بالخصوص وہاں کی ریاست کے حاکم حکمراں علامہ شبلی سے بے حد

متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ کی درخواست پر ندوہ کی امداد کے لئے پہلے انہوں نے ایک معقول رقم ماہانہ منظور کی۔ پھر ندوہ کی تعمیر و ترقی کے لئے پچاس ہزار کی بہت بڑی رقم منظور کی۔ یہ رقم تاریخ ندوہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے ندوہ کی کایا پلٹ ہوئی۔ یہ واقعہ علامہ شبلی سے بے حد متاثر ہونے کی واضح دلیل ہے۔ لیکن ریاست کے وزیر تعلیم میجر شمس الدین محمد کی آرا ملاحظہ ہوں۔ وہ مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب ''ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں'' کا مقدمہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''شمس العلما مولانا شبلی نعمانی نے تاریخ و سیر اور ادب صالح کی نئی راہیں نکالیں جن پر گامزن ہو کر ان کے تلامذہ اور دیگر ارباب علم نے علم و ادب کی نہایت مفید خدمات انجام دیں اور ایک ایسا لٹریچر پیدا کیا جس کی دل و دماغ کو بہت ضرورت تھی۔ مرحوم مولانا نے اس سلسلے کو جاری رکھنے کے لئے ۱۹۱۳ء میں ایک علمی ایسوسی ایشن ''دارالمصنّفین'' کے نام سے اعظم گڑھ میں قائم کی، مگر ہنوز اس کے ابتدائی مراحل بھی مکمل نہ ہوئے تھے کہ سفر آخرت پیش آ گیا۔ مگر ان کے ارشد تلامذہ علامہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی صاحب مرحوم و مغفور نے جو اپنے استاد کی تعلیم و تربیت کا بہترین نمونہ تھے، اس کی تکمیل کی۔ اور اپنی اور اپنے رفقا کی قابلیت سے کچھ ہی مدت میں اس ادارہ کو ملک کا مستند اور مقبول علمی ادارہ بنا دیا اور اس کی مطبوعات نے عالم گیر شہرت حاصل کی۔ ادارہ کی فہرست مصنفات و مطبوعات میں خود علامہ ممدوح کی تصنیفات، مضامین اور مقالات کی کافی تعداد ہے۔ جو سیرت و سوانح، تاریخ اور ادب و تحقیق کا شاہ کار ہیں۔''
>
> (ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں، ص:۳)

---

(۴)

خواجہ احمد فاروقی

[۱۹۱۷-۱۹۹۶ء]

خواجہ احمد فاروقی سابق صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف دہلی اردو کے ایک بڑے ادیب محقق اور نقاد تھے۔ تقریباً ایک درجن علمی وادبی کتابیں لکھیں بلکہ انہوں نے تاحیات اردو کی خدمت انجام دی۔

خواجہ صاحب نے مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی [۱۹۲۵-۲۰۰۲ء] کے مجموعہ مضامین ''نگارشات'' کا مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں دبستان شبلی کے سلسلہ میں انہوں نے ایک بڑی معنی خیز بات لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ان کی شخصیت اور کردار سازی میں ندوۃ العلما کو بہت بڑا دخل ہے جہاں انہوں نے تعلیم کی اعلی منزلیں طے کیں۔ جہاں انہوں نے شبلی اسکول سے جمالیاتی اسلوب تحریر کے طور طریقے، عبارت میں دلکشی اور رعنائی کے گر سیکھے۔ لطافت خیال، دقت نظر، قوت استدلال اور مضمون میں ندرت و جدت کے آداب واصول، جملوں کی ساخت میں حسن تناسب اور الفاظ و مضمون کے باہمی روابط کو سمجھا اور برتا۔ اصل میں ندوہ ایک تہذیب ہے، ایک نصب العین ہے، ایک روشنی ہے، تعلیم گاہ سے زیادہ قدروں کو سکھانے اور پھیلانے کا ادارہ ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ قدیم وجدید کا حسین نقطہ اتصال اور مرکز ہے۔'' (نگارشات، ص۱۴-۱۵)

اس طرح علامہ شبلی نعمانی کے ندوہ کی ان تمام خصوصیات اور امتیازات کی نشاندہی خواجہ احمد فاروقی نے مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس کے اسلوب نگارش اور ان کی تحریروں کی روشنی میں کی ہے جو واقعی دبستان شبلی کے امتیازات ہیں۔ حالانکہ صحیح یہ ہے کہ اس تحریر پر شاید ڈاکٹر عبداللہ عباس کی

نظر نہیں پڑی، ورنہ وہ یقیناً اپنی تحریر کی ان خوبیوں سے انکار کر دیتے۔

---

(۵)

مولانا عبدالسلام خاں رام پوری

[۱۹۱۷-۲۰۰۹ء]

مولانا محمد عبدالسلام خاں رام پوری بڑے عالم وفاضل، مصنف ومحقق اور صاحب نظر عالم تھے۔ مدرسہ عالیہ رام پور میں تدریسی خدمات کے ساتھ تحقیق وتصنیف سے بھی مدۃ العمر شغف رکھا۔ ان کی کئی کتابیں (افکار رومی، افکار اقبال، نسب افاغنہ، قواعد اردو) یادگار ہیں۔ ان کا ایک رسالہ ''تکملہ حیات سعدی'' ہے۔ جس میں انہوں نے حیات سعدی کے نظرانداز گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کی انہوں نے وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ تین پہلو مدت عمر، امرد پرستی، اور ہزل ہیں۔

اگرچہ مصنف مولانا عبدالسلام خاں کا یہ خیال ہے کہ

> ''مولانا شبلی نے شعر العجم لکھ کر تاریخ شاعری کی بنیاد ڈالی اور شعرا کے حالات زندگی کے تذکرے جو منتشر اور متفرق تھے ان کو یکجا کیا اور اس طرح سے تصنیفات اور حالات مصنف کا ایک مجموعہ بنایا ہے۔''
>
> (تکملہ حیات سعدی، ص:۳)

تاہم ان کا یہ بھی خیال ہے کہ سعدی پر امرد پرستی بھی انہوں نے منسوب کی ہے، جس کا مولانا حالی نے ذکر نہیں کیا ہے۔ (ایضاً، ص:۴)

پھر حیات سعدی کے ان تینوں پہلوؤں کا انہوں نے تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔

---

(۶)

ڈاکٹر سلیم اختر

[۱۹۳۴-۲۰۱۸ء]

اردو کے ممتاز ادیب اور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے علامہ شبلی کی یادگار دارالمصنّفین کا ذکر ڈاکٹر گلشن طارق کی کتاب ''عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات'' پر اپنی ابتدائی تحریر میں کیا ہے۔ اور اعتراف کیا ہے کہ

> ''اردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں دارالمصنّفین کا بڑا اہم کردار ہے۔ اپنے آغاز سے لے کر آج تک اس ادارے نے علم وادب کی بے حد خدمت کی ہے۔ دارالمصنّفین علامہ شبلی کا خواب تھا، جس کے لئے انہوں نے اپنی ساری جائیداد ادارے کے نام کردی اور ان کے دو ہونہار شاگردوں نے شبلی کے خواب کو تعبیر دی جن میں ایک نام سید سلیمان ندوی کا اور دوسرا عبدالسلام ندوی کا ہے۔'' (عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات، ص:۲۱)

---

(۷)

مشفق خواجہ

[۱۹۳۵-۲۰۰۵ء]

مشفق خواجہ (اصل: خواجہ عبدالحی) اردو کے نامور ادیب وانشاپرداز، شاعر، نقاد، محقق و مصنف اور مشہور کالم نگار تھے۔ ان کی گراں قدر خدمات کے صلہ میں حکومت پاکستان نے صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔ وہ ہندوستان میں بھی بہت مقبول تھے۔ علامہ شبلی اور ان کے دبستان سے بخوبی واقف تھے۔ مشہور اہل قلم اور مترجم ڈاکٹر محمد ایوب قادری [۱۹۲۶-۱۹۸۳ء] کی

کتاب ’’کاروان رفتہ‘‘ پرپیش لفظ میں انہوں نے لکھا ہے کہ

> ’’دبستان شبلی سے مراد اگر ایک مخصوص حلقے کے اہل قلم نہ ہوں اور اس اصطلاح کو وسیع معنوں میں استعمال کیا جائے تو وہ تمام اہل قلم جو ادب اور تاریخ سے یکساں دلچسپی رکھتے ہیں ان کو دبستان شبلی کے وابستگان میں شمار کرنا چاہئے۔اس اعتبار سے ڈاکٹر محمد ایوب قادری کو بھی دبستان شبلی کا نمائندہ سمجھا جاسکتا ہے کہ انہوں نے تاریخی وسوانحی اور ادبی موضوعات پر یکساں طور پر داد تحقیق دی ہے۔‘‘(کاروان رفتہ،ص:۷)

یہ بات سچ ہے کہ علی العموم دبستان شبلی علامہ شبلی اوران کے تلامذہ و منتسبین کے حلقے کے اہل قلم کو سمجھا گیا ہے۔جاوید غامدی صاحب نے اسی عنوان سے ایک مضمون لکھا تو انہوں نے بھی یہی بات سمجھانے کی کوشش کی،لیکن یہ واقعہ نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دبستان شبلی ایک خاص فکر واسلوب کا نام ہے۔اثرات شبلی کے مطالعے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ اس سلسلہ میں مرحوم مشفق خواجہ کا خیال درست ثابت ہوتا ہے۔

مشفق خواجہ مرحوم کا ذکر ہواوران کے کالموں کا ذکر نہ ہوتو بات ادھوری ہی خیال کی جائے گی۔انہوں نے ایک کالم میں حیات شبلی کے ایک اہم موضوع پر اظہار خیال کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ’’حق مغفرت کرے ایک بزرگ تھے منشی محمد امین زبیری۔۱۸۷۲ء میں نینی تال میں پیدا ہوئے ۱۹۵۸ء میں کراچی میں اللہ کو پیارے ہوئے۔عملی زندگی کا آغاز بمبئی کے مشہور تاجر ملا غلام حسین بوہرہ کی دکان سے کیا،جہاں وہ ملا صاحب کے کاروبار کا حساب کتاب لکھتے تھے۔لکھنے کے شوق نے اس حد تک ترقی کی کہ وہ بھوپال جاکر باقاعدہ مصنف بن گئے۔بمبئی میں حساب کتاب لکھتے تھے بھوپال میں بے حساب لکھنے لگے۔وہ اس طرح کہ بھوپال کے حکمراں خاندان کی ملازمت اختیار کرلی۔اس خاندان کے کئی افراد کی

سوانح عمریاں لکھیں جوفن سوانح نگاری سے نہیں ،فرائض منصبی سے تعلق رکھتی تھیں، پھرانہوں نے بعض قومی مشاہیر کے وارثوں سے ''معاملہ'' طے کر کے ان کی سوانح عمریاں لکھیں اور جومواد بھی ہاتھ لگا اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ یہ سب جمع وترتیب کے کام تھے اور وہ بھی صحافیانہ نوعیت کے، علمی حلقوں میں منشی صاحب کو وہ مقام نہ مل سکا، جس کے وہ خواہاں تھے۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ کوئی ایسا کام کرنا چاہئے جو دنیا میں یادگار رہے۔ انہیں معلوم تھا کہ کسی زمانے میں علامہ شبلی نعمانی اور عطیہ بیگم فیضی میں خط وکتابت تھی، انہوں نے شبلی کے خطوط عطیہ بیگم سے حاصل کئے اور شائع کر دئے اور پھر عطیہ بیگم سے ایک مضمون بھی لکھوایا جس میں مولانا شبلی کی کردار کشی کی گئی تھی۔ مولانا شبلی نے جو خط لکھے تھے ان میں سے بیشتر عطیہ بیگم کے خطوں کے جواب میں تھے، اس کے باوجود عطیہ بیگم نے اپنے آپ کو ''معصوم'' ثابت کرنے کی کوشش کی اور اپنے مضمون کے آخر میں بعض ایسے نازیبا الفاظ لکھے جن سے علامہ شبلی کی سخت توہین ہوتی تھی۔

منشی محمد امین زبیری کی خواہش کے مطابق اس مجموعہ مکاتیب کی بہت شہرت ہوئی تو منشی صاحب نے اس پر ایک نہایت زہریلا تبصرہ لکھا جو کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس میں علامہ شبلی کی ''رنگین زندگی'' کی تفصیلات پیش کی گئی تھیں۔ پہلے ''رنگین زندگی'' سے صرف عطیہ بیگم کا تعلق تھا، مگر اب کے منشی صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی عطیہ بیگم کی سطح پر لا کھڑا کیا۔ اس بدتہذیبی پر پورے ہندوستان کے عالموں اور ادیبوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے تو یہاں تک لکھا کہ

''منشی محمد امین صاحب اس کتاب کے بعد .... کسی مہذب سوسائٹی اور جماعت میں شریک ہونے کے قابل نہیں رہے۔''

لیکن سب سے دلچسپ تبصرہ سید ہاشمی فرید آبادی کا تھا۔انہوں نے کہا:

''منشی صاحب علامہ شبلی کے بارے میں بہت متشدد ہیں اس لئے انہیں منشی نہیں بالتشدید منشی کہنا چاہئے۔''

منشی صاحب اپنے اس کارنامے پر بے حد خوش تھے کہ انہوں نے ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے مصنف کی شخصیت کو داغدار کر دیا،لیکن یہ محض ان کی خوش فہمی تھی۔علامہ شبلی کے احترام میں کوئی کمی نہ آئی اور عطیہ بیگم کے نام ان کے خطوں کو ایک صاحب طرز ادیب اور شاعر کی خوش طبعی کے اظہار سے زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔ہاں منشی صاحب کو یہ فائدہ حاصل ہوا کہ ''حیات شبلی'' پر تبصرہ شائع کر کے وہ ملک گیر شہرت کے مالک ہو گئے،ورنہ پہلے ان کو بھوپال سے باہر کوئی نہ جانتا تھا اور اگر جانتا بھی تھا تو ریاستی وقائع نویس کی حیثیت سے۔

پاکستان آنے کے بعد منشی صاحب نے ''حیات شبلی'' پر اپنا تبصرہ از سر نو لکھا اور اسے ''شبلی کی رنگین زندگی'' کے نام سے ۱۹۵۲ء میں کتابی صورت میں چھپوایا۔اب کے انہوں نے عطیہ بیگم اور مولانا ابوالکلام آزاد کی جوانی کے زمانے کی تصویریں بھی کتاب میں شائع کیں لیکن اس مرتبہ کتاب کو کسی نے اہمیت نہ دی بلکہ اس پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ منشی محمد امین زبیری نے علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی بلند مرتبہ شخصیتوں پر کیچڑ اچھالنے کو اپنا مقصد حیات بنا رکھا ہے۔منشی صاحب کا خیال تھا کہ یہ کتاب خوب بکے گی، لیکن اسے کسی نے نہ پوچھا۔سارا اسٹاک بالآخر دیمک کی نذر ہو گیا۔''

(سخنہائے گسترانہ،ص:۳۰۲-۳۰۳)

یہ کالم کافی طویل ہے۔علامہ شبلی سے آگے اقبال تک پہنچا ہے اور منشی جی کی ایک ایک حرکتوں کا ذکر اس میں آ گیا ہے۔دلچسپ اور اہم بات یہ ہے کہ اس تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ مشفق

خواجہ علامہ شبلی سے کافی متاثر تھے۔

---

(۸)

مولانا حبیب ریحان خان ندوی

[۱۹۳۶-۲۰۰۹ء]

مولانا حبیب ریحان خان ازہری ندوی[۱۹۳۶-۲۰۰۹ء] ندوہ کے سابق مہتمم مولانا محمد عمران خان ازہری ندوی[۱۹۱۳-۱۹۸۶ء] کے بڑے صاحبزادے اور نامور عالم ومصنف اور مبلغ اسلام تھے۔ان کا شمار علامہ شبلی کے بڑے شیدائیوں میں ہوتا ہے۔ان کا خیال تھا کہ

> ''عہد جدید جدید کے معلم اول اور جدید وقدیم کے سنگم علامہ شبلی نے ہندوستان میں سب سے پہلے یہ آواز اٹھائی کہ تصنیف وتالیف کے تحقیقی وعلمی میدان میں قدم رکھنا چاہئے۔اور اپنے گوہر بار قلم سے دشمنان اسلام کے اعتراضات کا مکمل ومدلل جواب دینا بھی شروع کیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایسے طالب علم پیدا کرنے کی کوشش کی۔اور دارالمصنّفین جیسا تحقیقی ادارہ قائم کیا۔''

مولانا حبیب ریحان خان ندوی ازہری علامہ شبلی کے عاشق صادق تھے۔بھوپال میں دارالتصنیف والترجمہ قائم کیا تو اس کا انتساب علامہ شبلی کے نام کیا۔اس سے شائع ہونے والی ہر کتاب پر پورے ایک صفحہ میں یہ انتساب لکھا ہوا ہے،ان کی وفات کے ان کے لائق صاحبزادے نے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا اور خود مولانا مرحوم کی شخصیت پر جو کتاب شائع ہوئی ہے اس پر بدستور انتساب لکھا ہوا ہے۔وہ عبارت یہ ہے:

علامہ شبلی نعمانی کے نام

''دارالتصنیف والترجمہ کا انتساب ندوہ تحریک کے روح رواں اور معمار حقیقی

دارالمصنّفین کے موسس، اردو کے لافانی ادیب وشاعر، علوم اسلامیہ کے محقق اور سیرت نگار رسول اعظم ؐ ''شبلی'' کے نام کرتے ہوئے مجھے فخر ومسرت ہے۔شبلی کے نام اور کام کا سایہ علم وادب کا ابر کرم بن کر میری اور بے شمار علما و ادباء کی تحریری خدمات کو سیرابی بخشتا رہا ہے۔

شبلی کے معترفین، مداحین اور خوشہ چینوں کی تعداد بے شمار ہے۔شبلی استاذ الکل، عہد جدید کا معلم اول، جدید وقدیم کا سنگم، مجسمہ علم وفن و پیکر خدمت دین وملت، مصنف اور مصنف گر تھا۔

شبلی کی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے سامنے اور اپنے بعد علما و فضلاء کی ایسی جماعت چھوڑی جو اس نئے زمانے میں اسلام کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔شبلی کے خوشہ چینوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ شبلی کے نام کی ایک ایک سطر موجود ہے اور اردو ادب کا جز وبنتی جارہی ہے۔شبلی کے خیالات آج بھی فضا میں گونج رہے ہیں اور قوم کے دل ودماغ پر ان کا سکہ جاری ہے۔ شبلی کی رومانیت پر اعتراض کرنے والے گروہ کا جواب سید سلیمان ندوی نے ایک جملہ میں اس طرح دیا ہے:

''شبلی شبلی ہی تھے جنید وشبلی نہ تھے۔''

(مغربی تہذیب، انحطاط اور علاج، ص:۳۰)

---

(۹)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

[پ: ۹ رفروری ۱۹۴۰ء]

ماہر اقبالیات ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو علامہ شبلی سے بھی گہری عقیدت ہے۔ ۴۰ ربرس

پہلے ان کا مضمون ''سرسید،شبلی اور مغرب'' بہت پسند کیا گیا تھا۔مگر اس کے بعد انہیں اقبالیات نے موقع نہیں دیا۔البتہ ڈاکٹر گلشن طارق کی کتاب پر تبصرہ کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''اردو زبان وادب کے مشاہیر میں علامہ شبلی نعمانی کا شمار سر برآوردہ علما، محققین اور نقادوں میں ہوتا ہے۔ان کا کارنامہ صرف یہی ہے کہ انہوں نے سیرت ،ادبیات، تاریخ ،علم الکلام اور رجال پر چند بلند پایہ تصانیف یادگار چھوڑیں بلکہ اعظم گڑھ میں دارالمصنّفین قائم کر کے ایک ایسے علمی وتحقیقی ادارے کی بنیاد رکھ دی جس کے لائق مصنّفین نے اردو میں مختلف موضوعات پر بے مثال لٹریچر تیار کیا۔''(عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات،ص:۱۱)

ooo

[۵]

تحریک ندوہ میں علامہ شبلی
کے سوا اعظم گڑھ کا حصہ

ضلع اعظم گڑھ مشرقی اتر پردیش کا اگر چہ ایک معمولی ضلع اور خطہ ہے، لیکن ہر دور میں بعض حیثیتوں سے یہ خطہ مشرق میں بہت نمایاں اور غیر معمولی رہا ہے۔ مختلف تحریکوں بالخصوص مذہبی، تعلیمی، تہذیبی اور ملی تحریکوں میں اس کا بڑا نمایاں حصہ ہے۔ خانقاہی دور میں جگہ جگہ خانقاہیں آباد رہیں اور مختلف سلاسل کے صوفیا کا دور دورہ رہا۔

سرسید کی تعلیمی تحریک کی ترقی میں میں اس خطے نے نہایت اہم رول ادا کیا۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی تو پیش پیش تھے ہی ان کے علاوہ بھی متعدد اہل علم وکمال اور ملت کے بہی خواہ سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔

بعد میں دیوبند کی تعلیمی تحریک شروع ہوئی تو بھی اس علاقہ کی ذی شعوروں نے اپنا کردار ادا کیا۔ یہی سبب ہے کہ ہر مکتبہ فکر کے مراکز یہاں آباد ہیں۔

اسی طرح تحریک ندوہ میں علامہ شبلی تو اس کے روح رواں تھے ہی ان کے علاوہ بھی متعدد اہم نام ایسے ملتے ہیں، جنھوں نے اس تحریک میں بہت نمایاں حصہ لیا اور اس کا علمی وعملی ہر طرح سے تعاون کیا۔ مولانا عبداللہ محدث، مولانا حفیظ اللہ بندوی وغیرہ جید علمائے ندوہ کا تعلق اعظم گڑھ سے تھا۔ اس سلسلہ کی جو معمولی معلومات ہاتھ آئی ہیں اور جن کا عموماً ذکر نہیں ملتا، یہاں ان کا ذکر کیا جاتا ہے:

تحریک ندوہ کا پہلا جلسہ سب جانتے ہیں مدرسہ الٰہیات کان پور میں منعقد ہوا تھا اور اس میں منتخب روزگار علما شریک تھے۔۲۲ تا ۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء کو ندوہ کا جو جلسہ منعقد ہوا تھا مولانا محمد علی مونگیری نے اس اجلاس کی روداد (حصہ اول) شائع کی ہے اس میں چندہ دینے والوں میں علامہ شبلی کے علاوہ اعظم گڑھ کے درج ذیل اشخاص کے نام شامل ہیں:

۱۔ جناب شیخ حبیب اللہ صاحب وکیل و رئیس ضلع اعظم گڑھ

۲۔ جناب مولوی محمد سعید صاحب وکیل اعظم گڑھ

۳۔ جناب حافظ حسن علی صاحب وکیل اعظم گڑھ

الٰہی بخش مہتمم مدرسہ فیض عام نے ۱۸۹۴ء کی جو مفصل روداد شائع کی ہے اس میں تحریک ندوہ کو اعظم گڑھ کے درج ذیل چندہ دینے والوں کے نام ملتے ہیں:

۱۔ جناب شیخ کریم بخش صاحب	۸/
۲۔ جناب شیخ الٰہی بخش صاحب	۸/
۳۔ جناب شیخ عبدالمجید صاحب	۸/
۴۔ جناب حافظ حیات محمد صاحب	

دوسرے سال کی ندوہ کی سالانہ روداد میں اعظم گڑھ کے چندہ دینے والوں کے نام درج ہیں:

۱۔ مولوی عبدالغفور صاحب مدرس اول مدرسہ درگاہ اعظم گڑھ

۲۔ مولوی محمد داؤد صاحب وکیل عدالت صدرالصدور

مگران کے پتہ پر یہ نوٹ لکھا ہوا ہے کہ اس پتہ سے خط واپس آیا کہ وہاں کوئی نہیں ہیں۔ (رویداد سال جلسہ سال دوم، ص: ۱۲۸)

ندوۃ العلماء کا تیسرا سالانہ جلسہ ۱۱ تا ۱۳/اپریل ۱۸۹۶ء کو بانس بریلی میں منعقد ہوا تھا۔ اس کی روداد میں اعظم گڑھ کے کئی اشخاص کے ناموں کا اندراج ہے۔ مثلاً:

۱۔ حافظ حسن علی صاحب وکیل۔ اعظم گڑھ

۲۔محمد رمضان صاحب اعظم گڑھ

مولوی حکیم محمد علی صاحب اعظم گڑھی اس اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے۔انہوں نے معذرت نامہ بھیجا کہ

''افسوس ہے کہ میں بوجوہات چند شریک جلسہ نہیں ہوسکتا۔اگر زندگی ہے اور خدا کو منظور ہے تو آئندہ سال جلسے میں شریک ہو کر اس کے برکات سے مستفیض ہوں گا۔خداوند ندوۃ العلما کو یوماً فیوماً ترقی بخشے اور اس کے مخالفین کو سمجھ دے کہ مخالفت سے باز آئیں اور ندوے میں شریک ہو کر کار ندوہ میں مدد فرمائیں گے۔''(روداد جلسہ سال سوم،ص ۱۵۵)

مولوی محمد اعظم چریاکوٹی چریاکوٹ کے باشندہ،زبردست عالم دین اور ریاست حیدرآباد میں دفتر ریلوے کے منتظم تھے۔تحریک ندوہ کے بڑے حامی تھے۔بوجوہ شریک جلسہ نہ ہو سکے۔ان کا معذرت نامہ روداد میں شائع ہوا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ندوۃ العلما بلحاظ اپنے مقاصد عالیہ کے ایک ایسا مجمع ہے جس کی اعانت عبادت ہے اور شرکت سعادت،میرا مصمم ارادہ تھا کہ اس سال کے جلسے کی شرکت کا شرف حاصل کروں گا لیکن بیماریوں کے متواتر حملوں سے معذور اور معترف قصور ہوں۔دعا کرتا ہو کہ اللہ سبحانہ اس کے مقاصد برلائے اور اس کو اقصیٰ انعامات تک پہنچائے،آمین۔''

(روداد جلسہ سال سوم،ص:۱۶۱)

اسی سال یعنی ۱۸۹۶ء میں تریک ندوہ کی حمایت میں ملک کے متعدد مقامات جلسے ہوئے اور تحریک کے نام سپاس نامے بھیجے گئے۔ان سپاس ناموں میں ایک سپاس نامہ اعظم گڑھ سے بھیجا گیا ہے،اس سپاس نامہ میں علامہ شبلی کے دادا حسن علی،والد شیخ حبیب اللہ اور بندول و دیگر مواضعات اعظم گڑھ کے نمایاں اشخاص کے نام درج ہیں۔

اس سپاس نامہ کو پیش کرنے والوں میں ناموران اعظم گڑھ کے مختلف شعبوں کے افراد

شامل ہیں۔مثلاً وکلا،علماء وحفاظ اور بعض خانقاہوں سے وابستہ افراد کے بھی نام شامل ہیں۔سپاس نامہ درج ذیل ہے۔

سپاس نامہ از مسلمانان اعظم گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نستعینہ و نصل نسلم علے نبیہ الکریم

ہم تمام اہل اسلام نہایت ہی دلی خلوص اور اٹھتے ہوئے جوش مسرت سے عجز وادب کے ساتھ بعد ادائے مراسم سلام مسنون بدفعات ذیل عرض پیش کرنے کی اجازت وعزت حاصل کرنا اپنے فخر وجاہ افزائی کا باعث سمجھتے ہیں۔

(۱) وہ باوقعت مقاصد وافضل اغراض وفوائد جو ندوۃ العلما کے پرتاب کارناموں میں نمایاں ہیں اور وہ قیمتی لعل وگہر جس سے اس انجمن نے اپنی ہمت کے دامن مرصع کیے ہیں ان سے واقف ہوکر اور انہیں اچھی طرح مشاہدہ کرکے نہایت ہی ایمان کی سچائی دلی یقین موثق امید کے ساتھ ہم قرار کرتے ہیں کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ عظمت وشان کا جلسہ یہ شوکت وجلال کا دربار ہر اسلامی افراد کے لیے خوش قسمتی کی فال اور اپنے کثیر المنفعت ہونے کے اعتبار سے ہر مسلمان کے واسطے رحمت الٰہی کے آیت وخوش نصیبی کا مبارک شگون ہے اور یہ برگزیدہ ومحترم جلسۂ اسلامیہ ہر مقام کی جماعت اسلامی کے اتفاق واخوت ومذہبی برکت کی ترقی وقومی قوت کی حفاظت وعام بدنما حالتوں سے فلاح کا مستند ذریعہ اور نہایت ہی کافی اور یقینی وسیلہ ہے، ہم اعتراف کریں گے کہ اسلام کے خزاں خوردہ باغ میں بہار لانے کی تدبیر اور ہمارے ٹمٹماتے ہوئے اسلامی چراغ میں روشنی پھیلانے کا ذریعہ اور ہماری بجھتی ہوئی علمی وعملی دینی ودنیاوی شمع میں نور وتنویر پیدا کرنے کا طریقہ اس سے بہتر اور عمدہ ہونا بالکل ناممکن ومحال ہے، اس میں کچھ کلام نہیں کہ اسلام کی تمام دنیا میں یہ جلسہ اپنی برگزیدگی کے پرجلال عالم میں اپنا آپ مثال ہے وبلحاظ غیر محدود فوائد وکثیر برکتوں کے یہ ایک بےنظیر و پرشان دربار ہے۔

(۲) اسلامی جماعت کا پرادبار تنزل وقوم اسلام کی شکستہ حالی وزوال خیز ویرانی کا اقبال ظفر مندی سرسبزی وخوش قسمتی سے بدل جانا اور سرنو سے دینی عروج و دنیاوی اوج وعلمی وعملی شوکت کا حاصل ہونا اس میں کچھ کلام نہیں کہ تمام تر پیشوایان اسلام و ہادیان مذہب کی بے حد کوششوں اور دلی اعانتوں پر منحصر ہے، اس لیے یہ دربار ندوۃ العلما جو برگزیدہ پیشوایان اسلام ومبارک ہادیان دین پاک ومستعد خادمان اسلام کا عظیم الشان مجمع ہے اگر تائید سرمدی کو تحریک ہو تو اپنے اغراض و مقاصد میں خاطرخواہ فائز المرام ہوکر بے شبہہ ہماری بدقسمتی کے فیصلہ کرنے اور ہم کو مہر آسمان بنانے میں کامیاب ہوگا اور ہماری دینی و دنیاوی ضرورتوں کا کفیل بنے گا۔

(۳) جو برکتیں جو فائدے ندوۃ العلما کے فیض سے تمام ہماری قوم کو حاصل ہونے والے ہیں یا تمام جماعت اسلام جس فلاح و بہبودی سے مستفید ہوگی اور جس ہما کا سایہ اسلامیوں کے سر پر ہوگا اس کے قطع نظر یہ پرشان دربار ومحترم جلسہ ہر مسلمان کے نزدیک صرف اتنے ہی خیال سے نہایت کثیر العظمت، قابل تعظیم وادب، واجب الاطاعت، جلیل المرتبت ثابت ہوجاتا ہے کہ اس برگزیدہ جلسے اور مقدس انجمن کے رکن رسول خدا کے نائب اور اس کے حامی ومعین فخر انبیا کے وارث ہیں۔

(۴) ہماری ترقی و بہبودی کے اسباب پر غور کرنے اور ہمارے ارکان اسلام کے تحفظ و حفاظت کے وسائل سوچنے اور اس پر عملی کوشش کرنے اور ہدایت ورہنمائی فرمانے کی غرض سے ہمارے فخر رسل کے وارث ہمارے قابل تعظیم پیشوا ہمارے مقدس ہادی جو اسلام کی سچی ہمدردی کے جوش اور باغ اسلام کی ویرانی کے دردناک غم میں بھر کر زحمت سفر وصعوبت راہ وجرح اوقات کو برداشت فرما کر دور دراز ملکوں سے تشریف لاکر ایک خاص مقام پر جمع ہوتے ہیں اس میں کچھ شک نہیں کہ نہایت شکرگذاری کا باعث وموجب امتنان جماعت اسلامیہ ہے۔

(۵) ہمارے موجودہ نونہال امید وآرزو کی پرجوش تصویریں کشور اسلام کے آئندہ وارث و حامی، حال کی طرز تعلیم کے صدمے میں دینی علوم کی برکتوں سے بے نصیب و بے بہرہ نظر آتے ہیں اور ہو گئے ہیں وہ پرنور ضیا جو حضرت خیر البشرؐ لے کر آسمان سے اترے اب ایک کی پیشانی پر

جلوہ گرنہیں۔علوم جدیدہ کے فیضان سے بے دینی اور دہریت کی تاریکی نے ان کے پس وپیش عالم ظلمات کا پردہ ڈال رکھا تھا یا جہالت کی بھول بھلیاں اصل راہ سے نکال کر خطرناک خیال اور وسوسوں میں ان کو بہکا رہی ہے ایسی پرخوف حالت میں صد شکر کہ ہمارے حامیان اسلام وارث انبیاء فخر رسل کے نائب اسلام کے سچے اور جاں نثار خادم اس پرشوکت دربار میں نشست فرما کر ان اسباب پر غور کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے بچوں کو لے دینی ودہریت کے سمندر میں غوطہ لگانے سے روکے اور دنیاوی ترقی کی معراج اور اس کے عروج سے بھی یہ بے بہرہ تر ہیں اور نفرت قومی کدورت دلی عداوت قلبی ذلت غربت بے دینی دہریت اسراف لایعنی بیکار محض ہوجانے کے نقص وعیوب سے یہ پاک ومنزہ رہیں جن خدمات کی منت گذاری کہ ان کو اگر ہم اپنے بزرگان دین کی خدمت میں عرض کرنے کی جرأت بھی کریں ہمارے طرز بیان سے بالکل ناممکن ہے۔

(۶) ہم افسوس سے عرض کرتے ہیں کہ ہمارے دین کا پاک ومصفا چشمہ وہ اس کی دلکش طراوت وہ اس کے پانی کی خوشنمائی وہ اس کی خوش گوار روانی ولطافت اور اس کی عام فیاضی جس میں ایک عالم نے حصہ لگایا تمام آفاق جس سے پاک ومنزہ ہوا مشرق ومغرب کے دشت وبیابان تک جس سے سیراب ہوئے وہ ہمارے بے جا تعصب ناروا تو ہم فاسد خیالات غیر مہذب افعال پرخطر جہالت افسوس ناک غفلت ضرر رساں نفاق سے ایسا مکدر وناصاف ہوگیا کہ کسی ناگوار و کرخت بو کا الزام اس کے شہد آمیز پانی پر نہیں ہوسکتا ہے اگر ہماری غفلت کے کچھ دنوں یہی کرشمے اور رہتے تو یہ بالکل بیکار اور ناکارہ ہوجاتا الحمد للہ کہ جن پاک وبرگزیدہ ہاتھوں سے یہ خار خس دور کیے جاسکتے ہیں اور اس میں پھر باغ فردوس سے نہریں لائی جاسکتی ہیں وہ اب مستقل ارادے اور مستحکم نیت سے دربار ندوۃ العلما کا قائم فرما آمادہ ہوئے ہیں کہ اسلامیوں کو اس پاک معجزے کی کامیابی کی بشارت دیں جس کے لیے امید وآرزو سے ہم منتظر ہیں۔

(۷) اس لیے ہم تمام مسلمان سچے دل اور اٹھتے ہوئے جوش مسرت سے بذریعۂ سپاس نامۂ ہٰذا تمام پیشوایان اسلام ومتبرک ہادیان دین کا بالعموم بزرگان وبانیان ندوۃ العلما کا بالخصوص شکریہ ادا کرکے نہایت ہی پرادب ویقین دلانے والے لفظوں میں اپنی واقعی واتباع وکلی اطاعت کا اظہار

کرتے ہیں اور ایسے پاک و پر شوکت دربار اور ایسے محترم و برگزیدہ جلسے کے ساتھ ہمدردی کے اعتراف کو فخر وعزت کا باعث جانتے ہیں اور تہ دل سے یہ دعا کرتے ہیں:

قطرہ ہے تو بحر بیکراں ہو
ذرہ ہے تو مہر آسماں ہو

اس سپاس نامہ پر درج ذیل اشخاص کے دستخط ہیں:

۱۔ حسن علی وکیل عفی عنہ	:	موضع منگراواں کے رہنے والے ممتاز وکیل تھے۔
۲۔ حبیب اللہ	:	علامہ شبلی نعمانی کے والد (م:۱۲/نومبر ۱۹۰۰ء) شعر و ادب کا مذاق بڑا پختہ تھا۔ان کا ذکر علامہ شبلی نعمانی نے شعرالعجم میں کیا ہے۔
۳۔ عبدالحمید	:	صاحب تفسیر نظام القرآن مولانا حمیدالدین فراہی علامہ شبلی کے ماموں زاد بھائی۔
۴۔ محمد تفضّل حسین	:	
۵۔ محمد سعید وکیل	:	مولوی محمد سعید، موضع بندول کے باشندہ اور اعظم گڑھ کے ممتاز وکیل تھے۔مشہور شاعر اور وکیل امجد غزنوی کے سسر تھے۔شہر کے محلّہ کرمی ٹولہ میں مکان بنا کر یہیں آباد ہو گئے تھے۔غازی دلیل خاں میں مدفون ہیں۔
۶۔ محمد اسلم	:	
۷۔ شاہ محمد محی الدین	:	ساکن آستانہ قلندر پور پرگنہ نظام آباد ضلع اعظم گڑھ
۸۔ محمد عظیم اللہ وکیل	:	
۹۔ شاہ محمد یاسین	:	
۱۰۔ حبیب اللہ خاں کیل	:	علامہ شبلی کے بچپن کے احباب میں تھے۔ وکالت کرتے تھے۔مکاتیب شبلی میں ان کا نام آیا ہے۔

۱۱۔ عبدالحی	:	مختار تھے،موضع محمد پور نزد لبھر یا کے رہنے والے تھے۔
۱۲۔ سید عابد حسین عاؔبد وکیل	:	جون پور کے رہنے والے تھے۔اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے۔ان کا غیر مطبوعہ دیوان محمد عرفان جون پوری کی تحویل میں ہے۔
۱۳۔ محمد علی وکیل	:	
۱۴۔ عبداللطیف وکیل	:	
۱۵۔ العبد محمد عزیز الدین	:	نائب محافظ دفتر
۱۶۔ حافظ حبیب اللہ	:	موضع بندول کے باشندہ اور علامہ شبلی کے دوست تھے۔اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے۔
۱۷۔ محمد یوسف۔وکیل	:	موضع آنوک کے رہنے والے تھے۔
۱۸۔ محمد ہدایت اللہ	:	
۱۹۔ العبد احمد یار خان	:	
۲۰۔ عظمت اللہ	:	خواجہ عظمت اللہ: کشمیری نزاد اور تجارت پیشہ تھے۔شہر اعظم گڑھ کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔شبلی کالج کی انتظامیہ کے رکن اساسی تھے۔ان کے پوتے خواجہ شمیم وکیل نسواں گرلز کالج کے منیجر تھے۔ (مختصر تاریخ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی،ص:۸٦)

(روداد جلسہ سال سوم ندوۃ العلما،ص:۵-۸)

اس کے بعد کے اجلاسوں میں بھی اعظم گڑھ کے متعدد اشخاص کے ناموں کا اندراج ہے،مگر ان کی سوائے چندہ دینے کے اور کسی سرگرمی کی اطلاع نہیں ملتی ہیں۔

ابتدائی دور کے ان ہمدردان ندوہ کے اخلاص کو شرف قبولیت نصیب ہوئے۔

○○○

[۶]

برادرانِ شبلی

علامہ شبلی نعمانی چار بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ دوسرے مہدی حسن بیرسٹر، تیسرے محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد اور چوتھے محمد جنید نعمانی سب جج کان پور سب سے چھوٹے تھے۔

علامہ شبلی نعمانی فضل و کمال کے نیر تاباں تھے۔ ان کی عظمت و شہرت پوری دنیا میں ہے لیکن برادران شبلی کو وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ حتی کہ سلیقہ سے ان کا تذکرہ بھی سپرد قلم نہیں کیا گیا۔ بیرسٹر، جج اور برادر شبلی ہونے کے باوجود ان کے کسی بھائی کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ اور نہ اب ان کے حالات و کمالات کا کوئی ذکر کرنے والا موجود ہے۔ ناچیز نے اس سلسلہ میں نہایت تلاش و تفحص سے برادران شبلی کی سوانح زندگی کا ایک مرقع تیار کیا ہے اور اس غرض سے شائع کیا جا رہا ہے کہ ممکن ہے آئندہ کوئی اس میں اضافہ کر سکے۔

مہدی حسن بیرسٹر

محمد مہدی حسن بیرسٹر [م:۲۹/ جون ۱۸۹۷ء] نہ صرف خانوادہ شبلی، بندول بلکہ ضلع اعظم گڑھ کے ممتاز اشخاص میں ایک اہم نام ہے۔ وہ علامہ شبلی کے چھوٹے بھائی تھے اور اس خطہ اعظم گڑھ کے پہلے بیرسٹر ایٹ لا بھی۔

علامہ شبلی کی مذہبی تعلیم و تربیت کے بعد ان کے والد شیخ حبیب اللہ سرسید سے تعلقات اور ان کی تحریک علی گڑھ کے زیر اثر جدید تعلیم کی طرف راغب ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خطہ اعظم گڑھ

میں۱۸۷۴ء میں انہوں نے جس دینی درس گاہ کی بنیاد رکھی تھی اور جس میں مولانا فاروق چریا کوٹی وغیرہ مدرس اول رہ چکے تھے اس کا وجود مٹ گیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دوسرے بیٹوں محمد مہدی حسن، محمد اسحاق اور محمد جنید کو انگریزی تعلیم دلائی۔

محمد مہدی حسن ان کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ ان کی تعلیم کا آغاز بھی مذہبی نہج پر ہوا تھا۔ انہوں نے پہلے عربی وفارسی پڑھی پھر قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد ان کی انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ابتدائی انگریزی تعلیم انہوں نے اعظم گڑھ کے کس اسکول میں حاصل کی اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ البتہ ۱۸۷۹ء میں وہ علامہ شبلی کے ساتھ وکالت کے امتحان میں شریک ہوکر کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد وہ ایم، اے، او کالج علی گڑھ میں داخل کئے گئے۔ یہاں سے انہوں نے ۱۸۸۱ء میں انٹرنس اور ۱۸۸۴ء میں ایف، اے پاس کیا۔ یہ ایم، اے، او، کالج کے بالکل ابتدائی زمانہ کے طالب علم تھے۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی علامہ شبلی نعمانی علی گڑھ میں عربی و فارسی کے نئے نئے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔ ان کے کامیاب ہونے کی خوش خبری دیتے ہوئے انہوں نے اپنے خانوادے کے ایک شخص فرحت احمد کو لکھا کہ

> ''مبارک، سپاس ایزد کہ برادر شما عزیزی مہدی حسن در ایف.اے کامیاب نشست اے خوش آنکہ علی گڑھ رسم تو از پیش رسیدہ باشی و چوں از آمدنم آگہی اندوز شوی دوان سوئے من آئی واز جوش طرب حرف مبارک باد، برلبت گرہ گردد، لبے بہ تبسم واکنی بآواز گوئی کہ برادر مہدی حسن فال ظفر بنام خود یافت وپس ازاں دوسہ گامے تیز تر آئی وبمن درآویزی وگوئی کہ ہلہ! ہاں! شیرینی کجاست ومن گویم کہ درلب تو، باز انجمنے از یاران فراہم آید وہر یک گفتگو باز کند و گپے زندہ یارب ہمچنیں باد، بار دیگر مبارک باد۔
>
> ایں نامہ رانزو خود نگاہ باید داشت کمترین ہواخواہان
>
> شبلی نعمانی
>
> ۲۳/جون ۱۸۸۴ء

ترجمہ:

مبارک ہو

خدا کا شکر ہے کہ تمہارا چھوٹا بھائی مہدی حسن ایف اے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ جیسے ہی میں علی گڑھ پہنچتا، تم وہاں پہنچ چکے ہوتے۔ میری آمد کی خبر سنتے ہی دَوڑے چلے آتے۔ خوشی کے مارے تمہارے منہ سے بات نہ نکل رہی ہوتی۔ تمہارے دل کی حالت تمہارے تبسم سے ظاہر ہو رہی ہوتی اور پھر بے ساختہ تمہارے منہ سے نکلتا کہ بھائی مہدی حسن پاس ہو گیا۔ تم تیزی سے دو تین قدم آگے بڑھتے اور میرے سینے سے لگ جاتے اور پوچھتے کہ ہاں، [مہدی کے] پاس ہونے پر میری مٹھائی کہاں ہے؟ مَیں کہتا کہ تمھارے ہونٹوں پر۔ پھر دوستوں کی محفل آراستہ ہوتی اور خوب گپ شپ ہوتی۔ خدایا! ایسا ہی ہو۔ ایک بار پھر مبارک باد۔

ایک بار پھر مبارک باد۔

(مکاتیب شبلی جلد دوم ۲۰۱۲ء، ص: ۲۲۵)

اس کے بعد اپریل ۱۸۸۵ء میں مہدی حسن نے بیرسٹری کے لئے لندن کا رخ کیا۔ یہ خطہ اعظم گڑھ کا شاید پہلا واقعہ تھا کہ کوئی شخص اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک جائے۔ چنانچہ اس خوشی کے موقع پر ان کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل نے اعظم گڑھ میں ایک تقریب منعقد کی، جس میں معززین شہر اور روسائے اعظم گڑھ نے شرکت کی۔ علامہ شبلی علی گڑھ سے آ کر اس تقریب میں شریک ہوئے اور ایک دعائیہ نظم پیش کی جس کا آخری مصرعہ یہ تھا:

بہ سلامت روی و باز آئی

علامہ اقبال احمد خاں سہیل [م: ۱۹۵۵ء] کو جو بے مثال قوت حافظہ کے مالک تھے۔ اس نظم کے دو اشعار یاد رہ گئے تھے:

خار در دیدۂ وعدہ شکنی

حاسداں را جگر گداز آئی
ما بہ نادیدہ دور ہست باشیم
کہ تو ناگہ زدر فراز آئی

محمد مہدی حسن لندن میں ساڑھے تین سال زیر تعلیم رہے۔ اور وہاں سے پہلے بیرسٹری [بار ایٹ لا] پھر کیمبرج سے بی.اے. کیا۔انہوں نے ایک خط میں اپنے تعلیمی عزائم کا ذکر اس طرح کیا ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے

''میرا منشا محض بارسٹری کی سند حاصل کرنے کا نہیں ہے بلکہ پورے طور پر مقنن اور قانون داں ہونا ہے۔کیمبرج کا امتحان البتہ مشکل ہے اور وہاں قانون کی ڈگری میں آنر لینا آسان نہیں ہے،مگر اللہ سے امید ہے کہ مجھ کو کیمبرج کا بی.اے۔ایل.ایل.بی دونوں ملے گا۔ بعد ازاں مجھ کو تین برس میں ہندوستان میں بیٹھے بیٹھے ایم.اے اور ایل.ایل.ایم.کی ڈگری مل جائے گی۔اور اس کے پانچ برس بعد انشاء اللہ ایل.ایل.ڈی ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر [یعنی حکیم علوم] کا خطاب ملے گا۔ولایت میں ایم.اے وغیرہ کا امتحان نہیں ہوتا بلکہ ہر شخص جو بی.اے ہوتا ہے تین سال کے بعد ایم.اے ہو جاتا ہے۔''

مہدی حسن کا یہ تعلیمی سفر کسی وظیفہ کے تحت نہیں بلکہ یہ شیخ حبیب اللہ کی عالی حوصلگی کا نتیجہ تھا۔چنانچہ اس سفر کے تمام اخراجات انہوں نے خود برداشت کئے ۔ یہاں تک کہ مقروض ہو گئے ۔مہدی حسن کو ان تمام باتوں کا احساس تھا۔ایک خط میں لکھا ہے کہ

''اے میرے باپ!

میری بڑی تمنا یہ ہے کہ خدائے پاک مجھ کو اس قابل کر دے کہ میں آپ کو مکروہات زمانہ کی تکالیف سے سبکدوش کر سکوں۔میرے لئے عید کا دن وہ ہو گا جب میں آپ کو فارغ البال دیکھوں گا اور جب اس قابل ہوں گا

کہ آپ سے یہ کہہ سکوں کہ ''اے میرے پیارے باپ اب آپ کام نہ کیجئے۔آپ کا بیٹا مہدی سب کچھ کرے گا،اب آرام کیجئے۔'' ....والد صاحب علاوہ اس مہر پدری کے جو باپ کو بیٹے کی طرف ہمیشہ ہوتی ہے۔ آپ نے میرے ساتھ ایک خاص محبت رکھی ہے اور جو محنت اور خرچ آپ نے میری عمدہ اوراعلیٰ تعلیم کے بارہ میں برداشت کیا ہے اس کی نظیر کم مل سکتی ہے، یہ صرف آپ کے عمدہ خیالات اور مجھ کواعلیٰ تعلیم دینے کا اثر ہے کہ میں حافظ ہوا۔ میں نے فارسی پڑھی، میں نے عربی پڑھی، میں نے انگریزی میں علوم حاصل کیے اور بارسٹر ہوں .... اب اگر کوئی پوچھے کہ یہ باتیں مہدی کو کیونکر حاصل ہیں تو اس کا مختصراً جواب بجز اس کے کیا ہوسکتا ہے کہ مہدی کے پیارے باپ نے اس کی تعلیم عمدہ طور پرانجام دی۔

والد صاحب! مبارک ہے وہ باپ جو اپنے بیٹے کوایسی تعلیم دے اور مبارک ہے وہ بیٹا جو اپنے ایسے باپ پر فخر کرے۔اے اللہ اب مجھ کو اس قابل کر کہ میں اپنے پیارے باپ کی خدمت پورے طور پر کر سکوں اور اپنا فرض ادا کروں۔''

مہدی حسن ۸/اکتوبر ۱۸۸۸ء کو بی،اے آکسن اور بارایٹ لا کی سند لے کر وطن واپس آئے۔ان کے استقبال کے لئے شیخ حبیب اللہ نے اعظم گڑھ میں اپنے مکان پر ایک جشن منعقد کیا۔یہ جشن سات روز تک جاری رہا۔اور سات روز تک مسلسل دعوتوں کا سلسلہ قائم رہا۔ تمام عمائدین شہر وسرکاری عہدہ داران، حکام اور وکلا وغیرہ شریک ہوئے۔علامہ شبلی نعمانی علی گڑھ سے آکر شریک جشن مسرت ہوئے اور اس موقع پر ایک استقبالیہ نظم بھی پڑھی،جس کی ردیف آمدہ تھی۔یہ نظم اب کہیں دستیاب نہیں ہے۔علامہ شبلی اپنا دیوان شائع کرتے وقت اسے مولوی محمد سمیع سے مانگا تھا،مگر وہ دستیاب نہ کرا سکے۔یہی سبب ہے کہ وہ کلیات میں بھی شامل نہیں ہے۔

مہدی حسن کی آمد کی خوشی میں شیخ حبیب اللہ نے بندول میں ایک شاندار کوٹھی تعمیر کرائی

جو خستہ اورخراب حالت میں کسی قدر اب بھی موجود ہے اور تعمیر کرنے والوں کے عزم وحوصلہ کی داستان عزم وحوصلہ سنا رہی ہے۔لیکن اپنی بربادی پر شکوہ سنج بھی ہے۔

مہدی حسن بیرسٹر کی صحت لندن ہی میں خراب ہوگئی تھی جو وطن آ کر بھی بحال نہ ہوسکی۔ مجبوراًانہوں نے اپنے مرتبے سے اتر کر جنوری ۱۸۹۲ء میں الہ آباد ہائی کورٹ میں منصفی کا عہدہ قبول کرلیا۔ پانچ برس چھ ماہ اس منصب پر فائز رہے۔علالت دن بہ دن بڑھتی گئی۔ بالآخر اسی بیماری میں ۲۹؍جون ۱۸۹۷ء کو اعظم گڑھ میں وفات پائی۔اس حادثہ فاجعہ پر علامہ شبلی کس طرح ٹوٹ کر روئے،ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ’’لو بھائی ہم میں ایک عنصر کم ہوگیا۔عزیزی مہدی نے جان دی اور کس حالت کے ساتھ کہ کلیجے کے ٹکڑے اڑ گئے۔ میں بد بخت پاس تھا اور اس لیے جتنے تیر پھینکے سب میرے ہی جگر پر لگے۔ ہائے اس کی جواں مرگی۔ ہائے کیا معلوم تھا کہ وہ اس قدر جلد دنیا سے چلا جائے گا، ورنہ مجھ پر لعنت اگر میں اس سے ناراض رہتا۔ ہائے سب برائیوں پر وہ سب سے اچھا تھا۔ آج چوتھا دن ہے لیکن خدا کی قسم اس وقت تک دل نہیں ٹھہرتا۔سو بار رو چکا ہوں اور دل نہیں ٹھہرتا۔اس کی ایک محبوب یادگار ہے جسے وہ بین کہتا تھا،یعنی شافیہ،اس سے بار ہا لپٹ کر رو یا ہوں لیکن کچھ بھی تو تسلی نہیں ہوتی۔اس کو تسلی دینا چاہتا ہوں لیکن خود بے قرار ہو جاتا ہوں۔ایک اور اس کے نام سے وابستہ بدقسمت ہے جو پہلے چھوٹی بھاوج تھی،لیکن اب پیاری بہن ہے۔تم لوگ مزے سے باہر ہو۔یاں آفت زدوں کو سنبھالنا میرے سر چھوڑا ہے۔
> ہائے مہدی وائے مہدی۔بد بخت ازلی۔شبلی
>
> (مکاتیب شبلی جلد اول ص۹۹-۱۰۰)

مہدی حسن کی شادی گاؤں ہی میں ہوئی تھی۔ان کی بیوی کا نام عالیہ تھا۔مکاتیب شبلی میں ان کا ذکر آیا ہے۔مہدی حسن کے انتقال کے بعد علامہ شبلی عالیہ بیگم کے اخراجات کے لئے

ایک رقم بھیجتے تھے۔مہدی حسن کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔صرف ایک بیٹی شافیہ تھی جوان کے ماموں زاد بھائی حاجی شیخ محمد صاحب[م:۱۹۳۶ء] پھر یہاسے بیاہی تھیں۔۱۹۲۷ء میں مکہ مکرمہ میں دوران حج وہ راہی ملک عدم ہوئیں اوراسی پاک زمین کا پیوند ہوئیں۔ان کے بھی کوئی اولاد نہیں تھی۔اورانہی کی وفات پرمہدی حسن کی نسل کا خاتمہ ہوگیا۔

مہدی حسن کے داماد شیخ محمد ان کے ماموں زاد بھائی اور ایک بڑے زمین دار تھے۔ قومی وملی کاموں میں آگے بڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ان کے والد نے اپنی قیمتی زمین اگر دارالمصنّفین پروقف کی تھی توانہوں نے اپنی زمین شبلی نیشنل کالج پروقف کرکے صحیح وارث ہونے کا ثبوت دیا۔

مہدی حسن بڑے ذہین،طباع اور غیر معمولی شخص تھے۔افسوس کہ ان کی کم عمری کی موت نے ملک کوایک ماہرقانون داں،ایک ادیب اورایک انشاپرداز کی انشاپردازیوں سے محروم کردیا۔تاہم زمانہ تحصیل میں لندن سے انہوں نے اپنے والد شیخ حبیب اللہ، چچا شیخ مجیب اللہ اور برادراکبرعلامہ شبلی نعمانی کو جوخطوط لکھے،جس میں وہاں کے حالات،طرزمعاشرت اورعلم اوروقت کی قدروغیرہ گوناگوں واقعات وموضوعات پراظہارخیال کیا۔اس سے اس دور کے لندن بلکہ یورپ کاایک منظرنامہ سامنے آجاتا ہے۔مثلاً لندن کے بارے میں لکھا کہ

''اگر آپ یہ چاہیں کہ ہم اعلی درجہ کی شائستگی، اخلاق، محبت، انسانیت، صفائی، امارت، حسن،علم، دولت تمام خوبیوں کواونچے ٹیلے سے دیکھیں تو وہ بلند مقام اسی لندن میں مل سکتا ہے۔اگرآپ کو یہ منظور ہے کہ بدمعاشی، بدچلنی،قزاقی، دغابازی، دنیا بھر کی برائیوں کوشکل مجسم میں معائنہ کریں تو وہ لندن ہی کی سڑکوں پرممکن ہے۔''

[مکتوب بنام شبلی۔۵/جون۱۸۸۵ء]

یہ تمام خطوط انہوں نے بڑے دلچسپ اسلوب وانداز میں اور بے ساختہ لکھے ہیں۔ان کا اسلوب نگارش بڑاپرکشش اوردلفریب ہے۔ڈاکٹرابن فرید نے صحیح لکھا ہے کہ

''جہاں وہ گل افشانی پراترآتا ہےتوایسامحسوس ہوتا ہے کہ ایک شوخ

وسنگ پہاڑی ندی ہے جو اردو کی ناتراشیدہ چٹانوں کے درمیان اچھلتی، کودتی، بھاگتی، مڑتی، بل کھاتی چلی جارہی ہے۔''

(ادیب علی گڑھ۔ جولائی اگست ۱۹۶۳ء ص ۹)

ڈاکٹر ابن فرید نے مہدی حسن کے تمام [۶۲] خطوط کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ ان خطوط کو شائع ہونا چاہئے۔ اس غرض سے انہوں نے ایک مفصل مضمون بھی لکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ

''اگر اس کی اشاعت کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے تو غالب اور شبلی کے بین بین کا ایک منفرد اسلوب کا مالک مکتوب نگار منظر عام پر آ جائے جو لندن سے بیٹھ کر خط لکھتا ہے اور لاشعوری طور پر انگریزی فقروں، محاوروں اور بول چال کے جملوں کو اردو میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔''

(ادیب علی گڑھ جولائی اگست ۱۹۶۳ء ص ۸)

ڈاکٹر ابن فرید نے مہدی حسن کے خطوط کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور قدرے تفصیل سے اس کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

''مہدی کے خطوط میں ایک والہانہ پن ہے، شوخی اور بے تکلفی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا کہ ان کے خطوط میں علامہ شبلی کا اسلوب جھلکتا ہے۔ معلوم نہیں یہ اسلوب انہوں نے علامہ سے اخذ کیا ہے یا علامہ نے اپنے خاندان کے انگریزی داں رشتہ داروں سے اخذ کیا ہے، حجاب اور پردہ داری کا انداز مہدی کے یہاں نہیں پایا جاتا، وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں، مشاہدہ کرتے ہیں یا تجربہ کرتے ہیں وہ بے کم وکاست اپنے باپ کو بھی لکھ دیتے ہیں۔ یہ شبلی کے خاندان کی صفت ہے۔ علامہ شبلی کے لئے بھی یہی لطفِ بیان رسوائی کا باعث ہوا اور مہدی کے لئے بھی۔ اس کی جڑیں ہمیں ان دونوں کے والد شیخ حبیب اللہ کے یہاں ملتی ہیں۔ ان کو

جب مہدی کے خطوط ملتے تھے تو وہ اپنے حلقۂ احباب میں سناتے تھے جن پر حاشیہ آرائیاں ہونے لگیں اور شبلی کو مہدی کی یہ بدنامی ناگوار گذری، چنانچہ انہوں نے اس کا اظہار اپنے ایک عزیز مولوی محمد سمیع کے خط میں کیا اور ان کو ہدایت کی کہ وہ مہدی کو اس سلسلے میں احتیاط کی تاکید کریں۔ [مکاتیب شبلی ج۱ص۹۵] لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ علامہ نے خود کبھی احتیاط نہ کی۔ محمد مہدی کے خطوط سے ان کی بعض غیر معمولی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً زیادہ تر وہ پیراگراف اس طرح شروع کرتے ہیں جیسے کوئی مقرر سامعین کو خطاب کر رہا ہو۔ جزئیات نگاری میں ان کو کمال حاصل ہے۔ لطفِ بیان کے لئے لطیفے یا شگوفے بھی چھوڑتے چلتے ہیں۔ اپنی قابلیت اور ذہانت کا انہیں غیر معمولی طور پر احساس ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں، خود محظوظ ہوتے ہیں اور مکتوب الیہ کی تصدیق کے بھی متمنی رہتے ہیں۔ مگر جب ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی مدح سرائی خود کر رہے ہیں تو اس کی تاویل بھی کرتے ہیں۔ وفور جذبات سے ان کا ہر خط مملور ہتا ہے۔ لندن اور یورپ کا ماحول، عادات و اطوار اور معاشرتی اقدار کے سامنے ان کی نظریں خیرہ ہیں، لیکن ان کا دل ہمیشہ اعظم گڑھ، بندول اور جونپور میں اٹکا رہتا ہے۔ وہ دور رہ کر بھی اپنے عزیزوں کو نہیں بھولتے۔ بعض خطوط میں سلام کہنے کے لئے ناموں کی طول طویل فہرست درج کر دیتے ہیں۔ محمد سلمہ تو شاذ و نادر ہی ان کے کسی خط میں نظر انداز ہوتے ہیں۔ اپنے پتہ میں اپنے قلم سے مسٹر لکھتے ہیں، داڑھی منڈوانے، عورتوں کی حکومت اور مغربی لباس کے بے حد موئید نظر آتے ہیں، مگر یہ بھی نہیں بھولتے کہ ایک ہندوستانی کی شرف و مقبولیت کے لئے کن صفات کی ضرورت ہے؟ کیوں وہ بلند نہیں ہو پاتا؟ منشی محمد اکرام کے صاحب زادے محمد بلال اور دوسرے ہم وطن

عبدالرؤف سے خوش نہیں رہتے، لیکن جب ہندوستان واپس جاتے ہیں تو
مہدی اپنے والد کو تاکید کرتے ہیں کہ ان کے استقبال کے لئے وہ جونپور
جائیں اور اپنے یہاں قیام کروائیں۔ ان سب حقائق کو اگر مربوط کیا جائے
تو آخر انیسویں صدی کے مشرقی گھرانے کی تہذیب اور اخلاقی قدروں کا
واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تہذیب ہمیں ان خطوط کے ذریعے ذہنی طور
پر مرعوب اور احساس کمتری کا شکار نظر آتی ہے، مگر بعض اچھی صفات نے اس
کے اندر اتنی گہری جڑیں پکڑ لی ہیں کہ وہ اس وقت تک خشک نہیں ہوئی تھیں۔
یہ مشرق اور مغرب کی کشمکش کا دور تھا۔ ایک تہذیب دوسری تہذیب پر بڑی
تیزی کے ساتھ غالب آ رہی تھی، ایک رنگ ماند پڑ رہا تھا اور دوسرے کے
نقوش ابھر رہے تھے۔ مہدی کے خطوط میں ان رنگوں اور نقوش کو واضح طور پر
دیکھا جا سکتا ہے۔'' (ماہنامہ ادیب علی گڑھ، جولائی اگست ۱۹۶۳ء ص ۷-۸)
اس طویل تبصرہ سے مکاتیب مہدی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مہدی حسن کے خطوط ان کے خانوادے کے کسی فرد کے پاس محفوظ تھے۔ وہ اسے مرتب کر کے شائع کرانا چاہتے تھے اور غالباً اسی غرض سے انہیں دہلی لے گئے۔ ان سے یہ خطوط ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی [۱۹۳۷-۲۰۱۳ء] نے لئے اور ان پر ایک مضمون لکھا جو ان کے پہلے مجموعہ مضامین ''ادب اور وابستگی'' میں شامل ہے۔ اس کے بعد انہوں نے وہ خطوط ڈاکٹر ابن فرید کو دے دئے۔ ڈاکٹر ابن فرید نے بھی ان پر ایک مضمون ''محمد مہدی کے مکاتیب لندن'' لکھا جو ماہنامہ آج کل، دہلی [جون ۱۹۶۳ء] میں شائع ہوا۔ پھر یہی مضمون ماہنامہ ادیب علی گڑھ [جولائی، اگست ۱۹۶۳ء] میں چھپا۔ اس کو پڑھ کر بعض اہل ذوق نے ان خطوط کو شائع کرنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ ڈاکٹر ابن فرید نے ان ۶۲/ خطوط میں سے محض ۵/ خطوط ماہنامہ ادیب علی گڑھ میں ''شوق کا دفتر کھلا'' کے عنوان سے دو قسطوں [نومبر، دسمبر ۱۹۶۳ء] میں شائع کئے۔ اس کے بعد اس کی کوئی اور قسط شائع نہیں ہوئی اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ مجموعہ کیا ہوا۔

ناچیز نے اپنی کتاب ''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' میں ڈاکٹر ابن فرید کے شائع کردہ ۵/خطوط شامل کرنے کے علاوہ ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی کے مضمون سے مکاتیب مہدی کے اقتباسات بھی نقل کر دئے گئے ہیں۔ یہ اقتباسات انہوں نے تاریخ وار نقل کئے ہیں اور اچھا یہ کیا تھا کہ کثرت سے خطوط کے اقتباسات نقل کئے تھے۔ان کی بدولت مہدی حسن کے بہت سے خیالات اور خطوط کے اقتباسات محفوظ رہ گئے۔ڈاکٹر ابن فرید نے بھی اپنے پہلے مضمون [مطبوعہ ماہنامہ آج کل دہلی، جون۱۹۶۳ء] میں بعض اقتباسات نقل کئے ہیں،مگر انہوں نے کئی اقتباسات کو جو شیخ مجیب اللہ کے نام تھے،انہیں شیخ حبیب اللہ کے نام درج کر دیا ہے۔ حالاں کہ خود انہوں نے جو اصل خط شائع کیا ہے وہ شیخ مجیب اللہ کے نام ہے۔

چونکہ اصل خطوط دستیاب نہیں ہوئے اور مطبوعہ خطوط پر انحصار کرنا پڑا،اس لئے مہدی حسن کے املا اور رسم الخط پر بحث کی گنجائش نہیں تھی۔جن لوگوں نے یہ خطوط شائع کئے انہوں نے اس کا اہتمام نہیں کیا۔مثلاً مہدی حسن نے تقریباً ہر جگہ ڈاڑھی کو داڑھی لکھا ہے۔پٹخ کو پٹک اور بالکل کو ''بالکل'' لکھا ہے۔اسی طرح تیار کو ہر جگہ طیار لکھا ہے۔یاد رہے کہ علامہ شبلی بھی تیار کو طیار ہی لکھتے تھے۔ان کی تحریروں میں جہاں تیار لکھا ہوا ملے آپ تسلیم کر لیں کہ کسی نے تصرف کیا ہے۔

مہدی حسن نے عربی و فارسی جی لگا کر پڑھی تھی۔خطوط مہدی سے ان کی عربی و فارسی دانی کا اندازہ ہوتا ہے۔قرآن کی آیات،اردو و فارسی اشعار اور محاورات کا برمحل استعمال،ان کے علم وادب سے گہرے مطالعہ وشغف کا پتہ دیتے ہیں۔رہی جدید تعلیم کی بات تو اس میں تو وہ اپنے علاقہ کے پہلے شخص تھے جو لندن جا کر بارایٹ لا ہوئے اور جن کی انگریزی تقریر وتحریر کی داد اہل زبان نے دی۔جس کا ذکر انہوں نے اپنے بعض خطوط میں کیا ہے۔

مہدی حسن سرسید اور تحریک علی گڑھ کے کے نمائندہ تھے۔لندن میں انہوں نے طلبہ کے درمیان تقریباً ہر مواقع پر سرسید کی فکر کو نمایاں کیا۔اور جو طلبہ اس سے اتفاق نہیں رکھتے تھے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

باوجود ان سب باتوں کے حیات شبلی میں ان کا ذکر ایک دو جگہ ضمناً اور اجمالاً آیا ہے۔

اس سے نہ ان کی ابتدائی تعلیم کا اندازہ ہوتا ہے نہ ان کے افکار وخیالات کا۔حتیٰ کہ حیات شبلی سے ان کی تاریخ پیدائش بھی معلوم نہیں ہوتی ۔علامہ شبلی کوان سے بڑی محبت تھی ۔مکاتیب شبلی میں اس کے شواہد موجود ہیں۔خود مہدی اپنے بڑے بھائی علامہ شبلی کے فضل وکمال کے بڑے معترف و مداح تھے۔ان کے بعض خطوط میں بھی ان کا والہانہ ذکر آیا ہے۔مہدی حسن جب بیرسٹری پاس کر کے اعظم گڑھ واپس آئے تو ان کے والد شیخ حبیب اللہ نے اعظم گڑھ میں جو جشن منعقد کیا تھا، اس موقع پر علامہ شبلی نے مہدی حسن کے لئے والہانہ استقبالیہ نظم پڑھی۔البتہ ان کی دوسری ماں جو غیر کفو تھیں ان کی طرف داری کے سبب علامہ شبلی مہدی حسن سے کسی قدر ناخوش ہوئے اور اس کا اظہار بھی کیا،بس یہی ذرا سی گھر کی بات تھی جسے شیخ محمد اکرام نے ''شبلی نامہ'' میں افسانہ بنا دیا اور نفسیاتی مطالعے کے نام پر علامہ شبلی سے رشک وحسد کی داستان گھڑ دی،لیکن یہ محض شیخ محمد اکرام کی اختراع ذہنی ہے ۔ وہ مہدی حسن کی بے وقت موت پر پھوٹ پھوٹ کر روئے اور ہمیشہ رنجیدہ رہے۔احباب کے نام ان کے کئی خطوط میں اس رنجیدگی کا ذکر ملتا ہے۔۱۷رسال بعد منجھلے بھائی محمد اسحاق نے ۱۹۱۴ء میں یکا یک انتقال کیا،جو ان کے دست و بازو تھے،اس موقع پر بھی انہوں نے مہدی کی موت کا ذکر بڑی رنجیدگی سے کیا۔

دراصل مہدی حسن بہت بے باک اور بے ریا شخص تھے۔جو سوچتے،سمجھتے اور دیکھتے وہ بے دھڑک کہہ جاتے بلکہ کر جاتے تھے،جبکہ علامہ شبلی کو اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود علما سے کٹ کر رہنا گوارہ نہ تھا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شبلی کو بھائیوں میں مولوی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ سے زیادہ تعلق خاطر تھا۔علامہ شبلی خود تو علی گڑھ،حیدرآباد اور لکھنؤ میں علمی اور قومی کاموں میں مصروف رہتے اور ان کے بچے بندول اور اعظم گڑھ میں رہتے۔ان سب کی دیکھ بھال کا بار بھی مسٹر محمد اسحاق کے ذمہ تھا۔زمیندارانہ مشاغل اور اس کے تمام مسائل ومشکلات کا بار بھی مسٹر اسحاق ہی اٹھاتے رہے اور ۱۲رنومبر ۱۹۰۰ء کو شیخ حبیب اللہ کی وفات کے بعد سب کچھ انہیں کے ذمہ تھا اور وہ علامہ شبلی کی خواہشوں کا بہت احترام کرتے تھے۔نیشنل اسکول کی ذمہ داریاں بھی انہوں نے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھی تھیں۔مجلس موازنہ ترقی قومی اعظم گڑھ بھی انہی کے ذمہ تھی۔

وہ علامہ شبلی کے مزاج و مذاق کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ وفات سے چند ماہ پہلے انہوں نے اعظم گڑھ کے قصبات میں تعلیمی اداروں کے قیام کی بھی کوشش شروع کر دی تھی۔ انہیں اگر زندگی نصیب ہوئی ہوتی اور وہ اپنے عزائم کی تکمیل میں کامیاب ہو جاتے تو شاید اعظم گڑھ کا تعلیمی منظر نامہ آج کچھ اور ہی ہوتا۔ بہر حال ان وجوہات سے علامہ شبلی کو ان سے کچھ زیادہ تعلق خاطر تھا۔ پھر علامہ شبلی کے سوانح نگار مولانا سید سلیمان ندوی کا علامہ شبلی سے تعلق بھی اسی آخری دور کا ہے۔ مسٹر محمد اسحاق کے نام علامہ شبلی کے خطوط بھی انہیں زیادہ ہاتھ آئے اور انہوں نے جو دیکھا سنا اس کا ذکر فطری طور پر حیات شبلی میں زیادہ کیا۔ شیخ محمد اکرام اس معاملہ میں کیا کسی معاملہ میں حیات شبلی سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی کو مہدی حسن سے کچھ کم انس نہیں تھا۔ علامہ شبلی کے کئی خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہدی کے لئے برابر فکر مند رہے۔ خاص طور پر ان کی صحت کے سلسلہ میں۔ ایک بار مہدی نے ان سے کسی کی تاریخ کہنے کی فرمائش کی تو ایک کے بجائے دو، تین تاریخیں کہہ کر بھیجیں۔ وہ مکاتیب شبلی میں محفوظ ہو گئی ہیں۔

۱۹۱۴ء میں محمد اسحاق وکیل کی وفات پر علامہ شبلی نے جو دلدوز مرثیہ لکھا ہے، اس کے بعض اشعار میں بھی مہدی حسن کا نام آیا ہے۔ یہ ذاتی معاملات و مسائل اپنی جگہ لیکن مہدی حسن کے خطوط واقعی بڑے دلکش ہیں۔ ان سے جہاں خانوادہ شبلی کے حالات اور فکر و خیال کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں عہد شبلی کے ایک جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کے خیالات اور اس کے ادبی مذاق کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ

> ''مکاتیب مہدی میں ایک ادبی شان ہے۔ وہ ایک شگفتہ حوصلہ مند شخصیت کے ترجمان ہیں اور ان میں بڑا کس بل ہے۔ یوں بھی مولانا شبلی اور ان کے خاندانی ماحول کو سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ مفید بلکہ ضروری ہے۔ امید ہے کہ ان کی اشاعت کی سبیل پیدا ہو جائے گی۔ جس سے ادب اردو میں ایک بیش قیمت اضافہ ہو جائے گا۔'' (یادگار شبلی ص ۲۵-۲۶)

لیکن ان خطوط کی اشاعت اس وقت ممکن نہ ہو سکی اور پھر وہ خطوط کہاں گئے کچھ پتہ بھی

نہیں۔کہیں محفوظ ہیں یا ختم ہو گئے۔

پچاس برس بعد مجھے کتب و رسائل سے جو کچھ ہاتھ آیا اسے اپنی کتاب ''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' میں یکجا کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مطالعہ شبلی میں مکاتیب مہدی حسن کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

مسٹر محمد اسحاق وکیل

مسٹر محمد اسحاق وکیل [م: ۱۲/اگست ۱۹۱۴ء] ماہر قانون داں اور الہ آباد ہائی کورٹ کے نامور وکیل تھے۔ بڑے متحرک اور سرگرم شخص تھے۔ وہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے رکن رہے اور اس کے متعدد اجلاسوں میں بھی شریک ہوئے اور اس کا مالی تعاون بھی کیا۔

یہ علامہ شبلی کے منجھلے بھائی تھے۔ موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہوسکی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ گئے۔ وہاں سے بی.اے اور ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں۔ واپس آئے تو ہائی کورٹ الہ آباد میں وکالت شروع کی اور جلد ہی بڑی شہرت اور نیک نامی حاصل کر لی۔ عین جوانی میں ۱۲/اگست ۱۹۱۴ء کو یکا یک انتقال کیا۔ خانوادہ شبلی کے بعض بزرگوں نے بتایا کہ انہیں حسد میں زہر دیا گیا تھا، مگر اس کی تصدیق علامہ شبلی کی کسی تحریر سے نہیں ہوتی۔ ان کی تدفین الہ آباد میں ہوئی۔

مسٹر محمد اسحاق علامہ شبلی کے دست و بازو تھے۔ اور وہ انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ تمام گھریلو اور زمیندارانہ ذمہ داریاں انہیں کے سپرد تھیں۔ یہ علامہ شبلی کے بڑے معین و مددگار رہے۔ نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے اصلاً ذمہ دار بھی یہی تھے۔ اسے انہوں نے بہت ترقی دی اور مزید ترقی دینے کا عزم رکھتے تھے۔ وفات سے دو ماہ قبل ۶/جون ۱۹۱۴ء کو نیشنل اسکول کے استحکام کے لئے احباب اور عمائدین اعظم گڑھ کو جمع کیا اور ''اعظم گڑھ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی'' قائم کی، جس کے صدر علامہ شبلی، سکریٹری مولانا حمید الدین فراہی تھے۔ یوں تو اس سوسائٹی میں اعظم گڑھ کے متعدد رؤسا و عمائدین شامل تھے مگر بنیادی طور پر خانوادہ شبلی و فراہی پورے طور پر شامل تھا۔

مولوی محمد اسحاق نے خود کو اراکین میں شامل کیا مگر واقعہ یہ ہے کہ نام کو سب تھے مگر کام کے لئے سینہ سپر ہونا مولوی محمد اسحاق ہی کا کام تھا۔شبلی اسکول ہی نہیں وہ اعظم گڑھ کے تمام بڑے قصبات میں نیشنل اسکول قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے،اس کے لئے انہوں نے اپنی جیب سے ایک رقم [پانچ سو روپئے] بھی مختص کرلی تھی،مگر افسوس ان کی بے وقت کی موت سے ان کے سارے ارمان ادھورے رہ گئے۔علامہ شبلی کو ان کی موت سے سخت صدمہ پہنچا۔چنانچہ ان کا بڑا دلدوز مرثیہ لکھا،جوان کے اردو کلیات میں شامل ہے۔بطور نمونہ دو بند یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

ہم سے ناکاروں کی اک قوت عامل تھا وہی   مایہ عزت اجداد کا حامل تھا وہی
مسند والد مرحوم کے قابل تھا وہی   یوں تو سب اور بھی اعضا ہیں مگر دل تھا وہی
اب وہ مجموعہ اخلاق کہاں سے لاؤں
ہائے افسوس میں اسحاق کہاں سے لاؤں

یہ بھی اے جان برادر کوئی جانے کا ہے طور   اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور   کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور
چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

مرحوم اسحاق نعمانی کے بڑے پوتے جناب احمد اسحاق نعمانی ریٹائر نیوی کیپٹن کے بقول بڑے دادا یعنی علامہ شبلی انہی کے غم میں چل بسے۔مکاتیب شبلی سے بھی ان کے شدید دکھ اور صدمے کا اظہار ہوتا ہے۔

علامہ شبلی سے ان کی مسلسل خط و کتابت رہی۔مکاتیب شبلی میں ان کے نام ۲۶ رخطوط شامل ہیں۔اور مکتوبات شبلی میں تین نو دریافت خطوط شامل ہیں۔اس طرح اب تک ان کے نام ۲۹ رخطوط شائع ہو چکے ہیں۔ان خطوط سے بھی خانوادۂ شبلی کے ذاتی حالات اور اندرون خانہ واقعات کا ایک منظر سامنے آتا ہے۔

کھنڈا ضلع الہ آباد میں غالباً محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ کی سسرال تھی۔ان کی تین

شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی بیوی موضع بندول کی تھیں۔ دوسری غالباً اسی کھنڈا کی اور تیسری غازی پور کی رہنے والی تھیں۔ اول الذکر بیویوں نے کم مدت حیات پائی۔ البتہ آخر الذکر عرصہ تک زندہ رہیں۔ بعداز وفات انہوں نے اسحاق صاحب کی الہ آباد کی تمام زمین جائیداد پر قبضہ کرلیا تھا، اس کے لئے انہوں نے علامہ شبلی اوران کے چھوٹے بھائی مسٹر محمد جنید سب جج کان پور پر مقدمہ بھی کر دیا تھا۔ بہرحال علامہ شبلی نے ان سے صلح کر کے یتیم بچوں کا حق دلانے کی کوشش کی، صلح کے فوراً بعد علامہ شبلی نے بھی رخت سفر باندھا۔ اسحاق صاحب نے ۱۲/ اگست ۱۹۱۴ء کو اور علامہ شبلی نے ۱۸/ نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی۔ یہی وہ دور ہے جس میں علامہ شبلی سیرت نبویؐ اور دارالمصنّفین کو پایہ تکمیل پہنچانے کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ اور دونوں کو اس حد تک پہنچا کر رخصت ہوئے کہ دنیا آج بھی انہی کارناموں سے انہیں یاد کرتی ہے۔ بلاشبہ دونوں انتہائی عظیم الشان کارنامے ہیں۔

مولوی محمد اسحاق کے ایک عزیز دوست، شاعر وادیب، مصنف اور ''جہاں آرا'' کے مورخ مولوی محبوب الرحمٰن کلیم جیراجپوری [۱۸۶۸ - ۱۹۲۵ء] وکیل اور اعظم گڑھ ایجوکیشن سوسائٹی کے ایک رکن تھے، انہوں نے ان کا ایک مرثیہ لکھا تھا جو مطبع کاظمیہ جون پور سے شائع ہوا تھا، مگر اب وہ کہیں دستیاب نہیں ہے۔

محمد اسحاق وکیل کے نام علامہ شبلی کے خطوط سے خانوادۂ شبلی کے نجی اور ذاتی حالات کے ساتھ اسکول اور کالج کے سلسلہ کی مصروفیات کا بھی علم ہوتا ہے۔ علامہ شبلی نیشنل اسکول کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''سردست میرے نزدیک بھی وہ ایک حقیر صورت رکھتا ہے، لیکن ایک لوہار کی اس میلی چمڑی سے کم حیثیت نہیں ہے جس کو اس نے مدت تک اپنے پاؤں کے محفوظ رکھنے کے لئے استعمال کیا تھا اور جو بعد کو ایک معمولی علم پر چڑھ کر تین ہزار برس تک درفش کاویانی کے فخر آمیز لقب سے پکارا گیا۔''
>
> (مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۳۵-۳۶)

بلاشبہ مولوی محمد اسحاق نعمانی اعظم گڑھ کے انتہائی اہم اور نمایاں لوگوں میں تھے۔ ضلع

اعظم گڑھ کی تعلیمی ترقی میں ان کا بڑا نمایاں حصہ ہے۔

محمد جنید نعمانی

محمد جنید نعمانی [م:۱۲/اپریل ۱۹۳۳ء] سب جج کان پور علامہ شبلی نعمانی کے برادر اصغر تھے۔ ۱۸۷۸ء میں موضع بندول میں پیدا ہوئے۔ گھریلو تعلیم کے بعد شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ یہاں ان کے ایک لائق استاذ قاضی عبدالرحمٰن حیرت اعظم گڑھی تھے۔ وہ علامہ شبلی نعمانی کے شاگرد، ادیب وشاعر اور متعدد کتب ورسائل کے مصنف ومولف تھے۔ ان کے بعض رسائل کتب خانہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی میں محفوظ ہیں۔ علامہ شبلی کا ایک طویل مرثیہ ''ماتم شبلی'' بھی ان کی یادگار ہے۔ شبلی نیشنل اسکول میں استاد تھے۔ علامہ شبلی کے فرزند حامد حسن نعمانی [۱۸۸۰-۱۹۴۲ء] اور مسٹر جنید نعمانی [۱۸۷۸-۱۹۳۳ء] ہم عمر تھے۔ علامہ شبلی نے ان دونوں کی دیکھ بھال پر قاضی عبدالرحمٰن حیرت کو مامور کیا تھا۔ (ماتم شبلی ص ۱۵)

مسٹر محمد جنید نعمانی شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ایم اے او کالج علی گڑھ گئے۔ وہاں پہلے بی اے کیا۔ پھر قانون کی تعلیم حاصل کی۔ غالبًا ایل ایل بی پاس کیا تھا۔ بعد ازاں اعظم گڑھ واپس آ کر وکالت کا مشغلہ اختیار کیا۔ کچھ دنوں بعد منصف کے عہدہ پر منتخب ہو گئے۔ پھر ترقی پا کر کان پور میں سب جج کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ مرحوم کم گو اور خاموش مزاج تھے۔ نیشنل اسکول سے تعلق کے علاوہ کسی طرح کی ان کی سرگرمی کا ذکر نہیں ملتا۔ ۱۹۱۴ء میں ان کے بڑے بھائی محمد اسحاق وکیل نے جو اعظم گڑھ ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی تھی اس کے ایک رکن اساسی یہ بھی تھے۔ ابتدا میں اسکول کے کاموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ ایک میٹنگ میں جب ان پر فیس رکنیت ادا کرنے پر زور دیا گیا تو چند اراکین نے دعویٰ کیا کہ چونکہ وہ رکن اساسی ہیں اس لئے فیس نہ ادا کرنے کے مجاز ہیں، لیکن ان کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا گیا۔ بلکہ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ بہر صورت فیس رکنیت ادا کریں۔

مسٹر جنید نعمانی جب سب جج کان پور ہو کر کان پور چلے گئے تو کالج سے ان کی دلچسپی کم

ہوگئی اور پھر وہ بیمار ہوئے۔ برسوں علاج و معالجہ جاری رہا مگر جاں بر نہ ہو سکے۔ علاج کے لئے دہلی میں دو ماہ مقیم رہے۔۱۲/اپریل ۱۹۳۳ء کو دہلی ہی میں انتقال کیا۔ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔۱۳/اپریل ۱۹۳۳ء کے انقلاب میں ان کی وفات کی خبر ان الفاظ میں شائع ہوئی ہے:

''۱۲/اپریل کو حضرت مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی مولانا محمد جنید کا دہلی میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم دو ماہ سے بہ سلسلہ علاج دہلی میں مقیم تھے۔ مرحوم کے اعزہ بھی دہلی تشریف لائے ہوئے تھے۔ جامعہ ملیہ کے اساتذہ اور طلبہ نے شب ہی میں تجہیز و تکفین کے انتظامات کئے۔ ہمیں اس حادثہ فاجعہ پر مرحوم کے متعلقین کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔''

ان کے ایک ہی بیٹے انور نعمانی تھے۔ انہوں نے ہجرت کر کے مملکت خداداد کی راہ لی۔
محمد اسحاق وکیل کی وفات پر علامہ شبلی نے اردو میں جو پر درد مرثیہ کہا ہے، اس میں یہ دعا مانگی ہے کہ

اے خدا شبلی دل خستہ بایں موئے سپید
لے کے آیا ہے ترے درگہہ عالی میں امید
مرنے والے کو نجات ابدی کی ہو نوید
خوش وخرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید

(کلیات شبلی اردو ص:۔ ۲۰۴)

یہ بات صحیح ہے کہ ضلع اعظم گڑھ کی تعلیمی ترقی میں علامہ شبلی اور خانوادہ شبلی کا بڑا نمایاں حصہ ہے۔

[۷]

ایک عاشق شبلی

قاضی عبدالرحمٰن حیرتؔ

قاضی عبدالرحمٰن حیرت ادیب، شاعر اور ماہر تعلیم تھے۔ وہ اردو و فارسی دونوں زبانوں میں دادِ سخن دیتے تھے۔ وہ ضلع اعظم گڑھ کے ایک مردم خیز موضع قاضی کی سرائے کے رہنے والے تھے، جو اعظم گڑھ شہر سے ۱۵ رکلومیٹر شمال میں واقع ہے۔ یہ موضع اعظم گڑھ کے قضاۃ کا ایک اہم مسکن تھا۔ بعد میں انہوں نے شہر اعظم گڑھ کے محلّہ سیتارام میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اپنے تخلص کی نسبت سے اپنے مکان کا نام ''حیرت منزل'' رکھا تھا۔ اس میں ان کے ورثا آج بھی آباد ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ وہ حیرتؔ صاحب کی عظمت سے ناواقف ہیں۔

قاضی حیرت نے ابتدائی تعلیم کے بعد جارج ہائی اسکول اعظم گڑھ میں تعلیم حاصل کی، پھر وہیں استاذ (سکنڈ مولوی) مقرر ہوئے۔ اس وقت علامہ شبلی کے قایم کردہ نیشنل اسکول کا نام جارج ہائی اسکول ہو گیا تھا۔ اس سے وہ کب وابستہ ہوئے اور کب سبکدوش ہوئے صحیح تاریخیں معلوم نہ ہو سکیں۔ البتہ ان کے رسائل کی تاریخ اشاعت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غالباً ۱۹۰۵ء سے پہلے استاذ مقرر ہوئے اور ۱۹۲۹ء کے بعد ریٹائر ہوئے۔ یہاں کی تدریس کے زمانہ میں انہوں نے درجہ ۳، ۴، ۵ کے طلبہ کے لئے اردو نحو صرف کے کئی منظوم نصابی رسالے لکھے۔ اس میں دو رسالے راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔ انہوں نے اپنے رسائل کی جو فہرست دی ہے وہ یہ ہے:

ا۔ انگریزی قادرنامہ منظوم بخط اردو، جارج ہائی اسکول اعظم گڑھ، ۱۹۱۷ء

۲۔قادرنامہ منظوم (بخط ہندی)

۳۔ترجمان پارسی، جارج ہائی اسکول اعظم گڑھ، ۱۹۱۷ء

۴۔تہذیب القواعد: حصہ اول، جارج ہائی اسکول اعظم گڑھ، ۱۹۱۸ء

۵۔تہذیب القواعد: حصہ دوم

۶۔تہذیب القواعد: حصہ سوم

۷۔اپر پرائمری ریڈر مسمیٰ بہ گلدستہ تہذیب، جارج ہائی اسکول اعظم گڑھ، ۱۹۲۲ء

۸۔حیرۃ الفقہ، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۲۹ء

۹۔ماتم شبلی

۱۰۔فارسی آموز

۱۱۔مثنوی عجیب وغریب پر شین ٹیچر

اس میں بیشتر رسائل منظوم ہیں۔ ماہنامہ معارف میں چند رسائل پر تبصرے بھی شایع ہوئے ہیں۔اصلاً وہ بچوں کے ادیب اور شاعراورادب اطفال پر گہری نظر رکھنے والے اہل قلم تھے۔مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ

> ''مجھے اکثر مصنف ممدوح کے مسودات کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اوران کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کی زندگی کا مقصد زیادہ تر چھوٹے بچوں کی زندگی کی تہذیب واصلاح ہے۔اسی غرض سے وہ کتابیں اوررسالے لکھتے ہیں۔اوران میں تمام ضروری مسائل کو نہایت سلیس اور عام فہم بنادیتے ہیں۔'' (قاضی عبدالرحمٰن حیرت، حیرۃ الفقہ ص ۳۹)

حیرت صاحب پختہ مشق شاعر تھے۔زبان وبیان پر بڑی دسترس حاصل تھی۔ان کی نظمیں ملک کے مؤقر رسائل وجراید میں چھپتی تھیں۔مگر اس وقت ان کا کلام دستیاب نہیں۔البتہ انہوں نے بچوں کے لئے جو موضوعاتی نظمیں تہذیب القواعد میں لکھی ہیں وہ اس کتاب میں ضرور موجود ہیں اور آج بھی یہ نظمیں بچوں کے لئے بے حد مفید ہیں۔ایک مختصر نظم ''ماں باپ'' بطور نمونہ

ملاحظہ فرمائیں:

انسان کی سعادت ماں باپ کی ہے خدمت　　گویا بڑی عبادت ماں باپ کی ہے خدمت
سوراحتوں کی راحت ماں باپ کی ہے خدمت　　سونعمتوں کی نعمت ماں باپ کی ہے خدمت
دنیا میں بول بالا عقبیٰ میں نام روشن　　دونوں جہاں کی دولت ماں باپ کی ہے خدمت
دیکھونہ بھول جانا اس بات کو کبھی تم　　سب سے بڑی شرافت ماں باپ کی ہے خدمت
خدمت سے ان کی بچو غافل نہ رہنا　　ہوتی ہے جس سے عظمت ماں باپ کی ہے خدمت
دنیا میں پائے عزت ،عقبیٰ میں پائے جنت
حیرت عجب کرامت ماں باپ کی ہے خدمت

قاضی عبدالرحمٰن حیرت نے علامہ شبلی کا ایک بڑا پر درداور دلدوز مرثیہ ''ماتم شبلی'' کے نام سے لکھا تھا۔ جو پہلے اخبار نیر اعظم مراد آباد[جلد ۳۹ نمبر ۴۸، مورخہ ۲۶ ردسمبر ۱۹۱۴ء] اور روز نامہ زمیندار لاہور[۲۲ ردسمبر ۱۹۱۴ء] میں شائع ہوا۔ پھر کاظمی پریس جون پور سے رسالہ کی صورت میں شائع ہوا۔ اس کے بعد خود شاعر نے معارف پریس اعظم گڑھ سے جیبی سائز میں چھپوایا تھا۔ تلاش بسیار کے باوجود معارف پریس والا ایڈیشن دستیاب نہیں ہوسکا۔ البتہ کاظمی پریس والا ایڈیشن ہاتھ آ گیا ہے اسے ہو بہو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

قطرات اشک یعنی

ماتم شبلی

معروف باسم تاریخی

شکوہ بخت

۱۳۳۳ھ

مصنفہ

غمزدہ خاکسار

قاضی عبدالرحمٰن حیرتؔ
مدرس مسلم جارج اسکول اعظم گڑھ
مطبوعہ کاظمی پریس جون پور
باہتمام کاظم حسین
مالک کاظمی پریس جون پور۔ بماہ فروری ۱۹۱۵ء

ماتم شبلی

وہ قصے اور ہوں گے جن کو سن کر نیند آتی ہے
تڑپ جاؤ گے کانپ اٹھو گے سن کر داستاں میری

ہائے افسوس! علم وفضل کا آفتاب جو تمام عالم میں جلوہ گر تھا وہ آج غروب ہو گیا۔ خوش قسمتی سے اسلام کی کشتی کا ناخدا ایسا ہاتھ آیا تھا جو مصیبت اور رنج کے طلاطم میں مدد کرتا رہا۔ افسوس اس کشتی کا آج کوئی ناخدا نظر نہیں آتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے استادنا المعظم شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کے علم وفضل وہنر اور فیض وبرکت کی تجلی سے پریس، ندوہ، اسکول، کالج، انجمن وغیرہ وغیرہ ہر ایک منور وروشن تھا۔ آج دیکھو تو ان مقامات میں ظلمت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ اور ہر روشن خیال طالب العلم اور پروفیسر وغیرہ سراسیمہ ہیں۔ ادھر انجمن کے ارا کین اور معزز ممبروں کی زبان سے ہائے شبلی ہائے شبلی کی صدائیں آرہی ہیں۔ اور شعر کی آواز سے ہر طرف انجمن کے کمرے گونج رہے ہیں۔

ہائے افسوس کہاں قوم کا وہ بانی ہے
زینت بزم کہاں شبلی نعمانی ہے

شعراپنی یتیمی اور بے کسی پر نالاں اور مضطر ہے۔ ہائے رے قسمت ابھی تو قوم خود مبتلائے امراض تھی اور صحت کا معجون ہنوز کافی طور پر مرکب نہ ہونے پایا تھا کہ وہ مسیح زماں آنکھوں سے نہاں ہو گیا۔ وہ رہبر قوم جس کے فضل اور کمال اور اسلامی ہمدردی پر قوم کو فخر وناز تھا آہ! آہ!

سالار قوم باغ فردوس میں جلوہ فرما ہوا،محفل عالم سونی ہوگئی۔علامہ مرحوم کی ذات ستودہ صفات تمام خوبیوں کی جامع تھی۔فضائل ومحاسن کیا کچھ نہ تھے۔علامہ،فقیہ،ادیب،فلسفی،لیڈر،مورخ، پروفیسر،شاعر،مصنف،انشاپرداز،اسپیکر،خوش بیان،خوش سواد،نکتہ سنج،نکتہ شناس،عالی دماغ، صافی طبع،خوش وضع،دریادل،خوش مزاج،خوش لحن،ظریف الطبع،دقیق النظر،سیاح،پھر ایسے جامع اوصاف کے محاسن صفحۂ دل سے کیونکر محو ہوسکتے ہیں۔جس قدر اہل اسلام اس سانحہ قیامت انگیز پر اظہار رنج وغم کریں بجااور درست ہے۔مسلمانوں دعا کرو کہ پردہ غیب سے ایک شبلی ثانی عالم میں نمودار ہوجائے تا کہ بجائے علامہ کے مصلح قوم بن جاوے اورقوم کے ڈوبتے بیڑے کی ناخدائی کرے۔ممکن ہے کہ قوم کا منتشر شیرازہ جمعیت پذیر ہوجائے۔

عجب کیاہے یہ بیڑاغرق ہوکر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

قاضی عبدالرحمٰن حیرت اعظم گڑھی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نوحہ اولی

وما کان شبلی هلکه هلک واحد
ولکنه بنیان علم تهدما

علم اور فضل کا جو جوہر روحانی تھا　　وہ کہ جو فن کمالات کا اک بانی تھا
مصر اسلام کا جو یوسف کنعانی تھا　　وہ کہ جو رحمت حق سایہ یزدانی تھا
حیف صد حیف کہ تاریک جہاں ہوتا ہے
آفتاب اس کی تجلی کا نہاں ہوتا ہے

بے محل تھا ابھی محفل سے تیرا گھبرانا　　تیری کوشش کو تو باقی تھا ابھی پھل لانا
جلوہ سیرت نبوی تھا ابھی دکھلانا　　کیوں پسند آیا تجھے ملک عدم کا جانا

یوں بھلا عزم فنا کوئی بشر کرتا ہے
میرے آقا کوئی اس طرح سفر کرتا ہے
فکر تھی نیشنل اسکول کی تجھ کو اکثر کہ سنبھل جائے کسی طرح یہ گرتا ہوا گھر
اور سرامیر کا بھی مدرسہ تھا پیش نظر کہ چمک جائے نصیبے کا کچھ اس کے اختر
مگر افسوس کہ وہ نیر تاباں نے رہا
باغ امید کا وہ سرو خراماں نہ رہا
اٹھ گیا آج زمانہ سے ہمارا رہبر چمن دہر میں تھا جس کا نہ کوئی ہم سر
قلزم فیض و شرافت کاوہ یکتا گوہر مطلع علم ولیاقت کا وہ مہر انور
تھا یہاں جس کی مسیحا نفسی کا شہرا
آج دیکھو تو ہے وہ چرخ چہارم پہ چھپا
ہائے اے قوم وہ اسلام کا تارا نہ رہا نائب احمد مختار کا پیارا نہ رہا
قوم کی بزم کا وہ انجمن آرا نہ رہا ہم کو تھا جس پہ بھروسہ وہ سہارا نہ رہا
آہ ! وہ رحمت یزدانی کہاں سے آئے
یعنی وہ شبلی نعمانی کہاں سے آئے
بزم سونی ہے ہر اک دل میں ہے رنج وآلام اب مئےعیش سے خالی ہے ہر اک شیشہ وجام
قوم کی بزم میں دیکھو تو مچا ہے کہرام منعقد جلسہ ماتم ہے بافسوس تمام
ہائے افسوس کہاں قوم کا وہ بانی ہے
اب کہاں صدر نشیں شبلی نعمانی ہے
فلک فضل وکمال کا وہ مہر منیر عہد غزالی و رازی کی سراپا تصویر
یوں تو ہر فن میں تھا وہ جامع اوصاف کثیر تھا وہ تاریخ وادب میں مگر آپ اپنا نظیر
اس کا ہے فضل وہنر شہرہ آفاق تمام
مصر سے روم تک اور ہند سے لے کر تا شام

کون ساعلم ہے وہ جس میں کہ ممتاز نہ تھا　　انجمن کون سی ہے جس میں سرافراز نہ تھا
کس چمن میں وہ بھلا بلبل شیراز نہ تھا　　نظم اور نثر کے کس جملہ میں اعجاز نہ تھا
تھا حقیقت میں وہ اک جامع اوصاف کمال
آہ ! کیا کیا میں لکھوں اس کے محاسن کا حال
وہ دل آویز سخن اور وہ شیریں گفتار　　طرب انگیز لطائف وہ جلالت وہ وقار
وہ خوش آواز بیاں اور وہ دلکش اطوار　　وہ نفاست وہ متانت وہ بزرگانہ شعار
اس کی ہر طرز دل آویز پسندیدہ تھی
جو ادا تھی وہ خوش آیندہ دل ودیدہ تھی
وضع داری میں تھاایک طرح سدااس کا شعار　　وضع میں اس کی نہ کچھ پایا تغیر یک بار
ابتدا ہی سے رہا ایک ہی حالت پہ قرار　　طرز وانداز میں کچھ فرق نہ آیا زنہار
گو زمانہ کی ہوا ئیں بھی چلی ہیں سو رنگ
پر تغیر نہ ہوا اس کا قدیمانہ ڈھنگ
اسکے جانے کا تو یوں رنج ہے ہراک دل پر　　پر جو شیدائی ہیں ان کی تو ہے حالت ابتر
رنج فرقت سے ہے ہر ایک نہایت مضطر　　ہوگئے زخم سے آغشتہ بخوں قلب وجگر
ہائے وہ جامع اوصاف کہاں ہے باقی
ہاں اگر باقی ہے تربت کا نشاں ہے باقی
اب مجھے چشم عنایت سے بلائے گا کون　　پاس اعزاز ومحبت سے بٹھائے گا کون
راستہ حیرت ناداں کو دکھائے گا کون　　آہ ! حق بات بہ تحقیق سکھائے گا کون
دل پریشاں ہے افسوس کہاں میں جاؤں
آہ! آقا دل نادان کو میں کیا سمجھاؤں
اپنا افسانہ غم ہائے سنائیں کیوں کر　　اب بھلا دفتر معنی کو دکھائیں کیوں کر
اب تمنا ئیں مرے دل کی برآئیں کیوں کر　　جذبہ شوق سے اب بنگلہ[۱] پہ جائیں کیوں کر

اب مرے دل میں کہاں ہے وہ مسرت باقی
آرزو خاک ہوئی رہ گئی حسرت باقی

مرے تلمیذ معزز وہ جنید [۲]خوش کلام　　اور وہ حامد نعمانی [۳] عزیز خوش نام
رہیں یہ دونوں زمانہ میں بصد عیش مدام　　خم گردوں میں ہے جبتک کہ مہ ومہر کا جام

کیا لکھوں قصہ غم ہائے وہ آقا نہ رہا
اب تو دل میں مرے وہ جوش وہ جذبہ نہ رہا

نوحہ ثانیہ

کچھ نہ پوچھو دوستو محفل میں کیا کہنے کو ہیں　　آج احوال غم دل برملا کہنے کو ہیں
غنچہ دل جو شگفتہ تھا ہوا پژمردہ حیف　　بلبلوں[۴] سے قصہ وحشت فزا کہنے کو ہیں
آج بزم تعزیت میں باغم وچشم پر آب　　اپنے اک مخدوم کا ہم مرثیہ کہنے کو ہیں
نیشنل میں ندوہ میں یارب یہ کیسا حشر ہے　　اپنی اسپیچوں میں سب واحسرتا کہنے کو ہیں
آج دل تھامے ہوئے بیٹھے ہیں ارباب ادب　　صدمہ جور فلک کا ماجرا کہنے کو ہیں
اے فلک اب تو سنبھل جانا کہ سوز دل سے آج　　داستان غم پراز آہ وبکا کہنے کو ہیں
شبلی نعمانی کی رحلت کا جو دل پر ہے داغ　　سوزش دل سے بصد کرب وبلا کہنے کو ہیں
دیدہ اعدا بھی ہیں اس رنج وغم سے اشکبار　　دوستو! سوز دروں بے انتہا کہنے کو ہیں
جل نہ جائے آتش غم سے کہیں اپنی زباں　　پارہ آتش ہے ہم جو ماجرا کہنے کو ہیں
اٹھ گیا وہ بلبل شیراز باغ ہند کا　　جس کو ہم جرجان[۵] کا پیر ہدا کہنے کو ہیں
فیض سے اس کے مشرف تھے ادیبان جہاں　　ہم ادیبوں کا اسے اک پیشوا کہنے کو ہیں
آستاں [٦] بوس خلیل و زائر قبرنبی　　اس کو ہم اک حاجی بیت الہدی کہنے کو ہیں
شاعرو رہبرمورخ اور مصنف اور ادیب　　عالم دوراں فقیہ بے ریا کہنے کو ہیں
جدت طبعی سے پڑتی تھی جو نکتوں پر نگاہ　　موجدوں کا ہم اسے اک رہنما کہنے کو ہیں

سایہ تعلیم سے اس کے ہوئے ہم سب غنی　　ہم تو اس کے سایہ کو ظل ہما کہنے کو ہیں
حبذا گفتار شیریں وہ ادائے دل فریب　　خوبی اوصاف پر صدمرحبا کہنے کو ہیں
قوم کا حامی رہا جب وہ پھنسی گرداب میں　　قوم کی کشتی کا اس کو ناخدا کہنے کو ہیں
ماحی جہل وضلالت حامی اسلام وشرع　　ہادی دین حبیب کبریا کہنے کو ہیں
مرتے مرتے لفظ سیرت[ے] پر ہو جس کا خاتمہ　　ہم اسے شیدائے محبوب خدا کہنے کو ہیں
سی وصدق میں صدیق کی تصویر تھا　　اس لئے ہم مجمع صدق وصفا کہنے کو ہیں
دیکھ کر تحریر الفاروق کی پھر ہم اسے　　اک نمونہ حضرت فاروق کا کہنے کو ہیں
سیرۃ النعمان کا اکسیر نسخہ دیکھ کر　　اس کو ہم نعمان کا اک جاں فدا کہنے کو ہیں
جب کہ پڑ جاتی ہے اپنی الغزالی پر نگاہ　　پھر تو غزالی کا اس کو ہم نوا کہنے کو ہیں
حضرت رومی کی وہ رنگیں سوانح دیکھ کر　　ہم اسے تو اک ولی باصفا کہنے کو ہیں
وہ مجسم روح تھا روحانیوں سے جا ملا　　یوں تو دنیا میں بہت سے باخدا کہنے کو ہیں
ختم ہوسکتا نہیں ہے دفتر غم کا بیاں　　اور بھی حضرات مضمون عزا کہنے کو ہیں
مشفقی سید سلیمان مولوی عبدالسلام　　نوحہ جاں سوز اک حسرت فزا کہنے کو ہیں

روک لے حیرت قلم اب ختم کر غم کا بیاں
مولوی مسعود علی بھی کچھ جدا کہنے کو ہیں

نوحہ ثالثہ

مجلس عیش میں ہے غم کا فسانہ کیسا　　نظر آتا ہے یہ نیرنگ زمانہ کیسا
محفل علم میں چھائی ہے خموشی کیسی　　علماء کا متغیر یہ ہے چہرہ کیسا
آج کیوں سرد ہے ارباب سخن کا بازار　　ان میں ہنگامہ ماتم ہے یہ برپا کیسا
آج کیوں بزم ادب میں یہ مچا ہے کہرام　　منتشر آج ہے شیرازہ انشا کیسا
جلوہ علم سے کل تک تو جہاں تھا روشن　　آج عالم میں ہے یارب یہ اندھیرا کیسا

پوچھتے مجھ سے ہیں محفل کے بزرگان کبار　　کیسا ماتم ہے پراز غم ہے یہ کمرا کیسا
نیشنل سے ہے ادھر آہ وفغاں کی فریاد　　اور ادھر غم سے پر اندوہ ہے ندوہ کیسا
ہائے کس دل سے بتاؤں کہ ہے کیا غم کا سبب　　باعث رنج ومحن خود ہے ہویدا کیسا
یعنی وہ شبلی نعمانی شمس العلماء　　صورت مہر جو تھا دہر میں چمکا کیسا
اٹھ گیا ہائے وہ دنیا سے ہمارا مخدوم　　غم سے دل پارہ ہے صد چاک ہے سینا کیسا
تھے نذیر احمد وحالی[۸] بھی ثنا خواں اس کے　　ہنر وفضل میں تھا فاضل و دانا کیسا
کیوں نہ ہم فضل وکمالات پہ اسکے روئیں　　صدف دہر میں تھا وہ در یکتا کیسا
ایسا علامہ کہ سلطان نے کی قدر اس کی　　قصر یلدیز میں بھی جا کے وہ چمکا کیسا
بخشا سرکار نے شمس العلماء کا بھی خطاب　　بزم عالم میں اس مہر کا شہرا کیسا
تھی دل آویز جو تقریر تو دلکش تحریر　　اس کی باتوں میں تھا اعجاز مسیحا کیسا
کیا ہوا آج وہ مخدوم ہمارا افسوس　　جس کی تھا ذات گرامی پہ بھروسا کیسا
یہ وہ نوحہ ہے کہ کلیجے کو ہلا دیتا ہے　　آہ! اللہ نے یہ دن ہے دکھایا کیسا
عبد رحمٰن جو ہے ایک فدائے شبلی　　غم کے آنسو کا بہاتا ہے وہ دریا کیسا
آتش غم سے یہ ڈر ہے کہ نہ جل جائے زباں　　درد انگیز جگر سوز ہے قصہ کیسا

سن کے روپیٹ کے کہتے ہیں ارباب سخن
رو کے حیرت نے ہمیں آج رولایا کیسا

حواشی:

(۱)　یعنی شبلی منزل جس کی آستاں بوسی روزانہ مجھ پر فرض تھی اور اسی شبلی منزل میں علامہ ممدوح کا مزار ہے۔

(۲)　مسٹر جنید نعمانی ، خاکسار کے معزز شاگرد، مولانا مرحوم کے عزیز بھائی ہیں جو سر دست بعہدہ منصفی ممتاز ہیں۔

(۳)　مسٹر حامد نعمانی، خاکسار کے خاص شاگرد، مولانا مرحوم کے خلف الرشید ہیں اور اس وقت

بعہدہ نائب تحصیل داری معمور ہیں۔

مراثی میں عموماً مقوفے کے مراثی محاسن کا رونا رویا جاتا ہے لیکن مولانا شبلی مرحوم کے اخلاق پر ان بزرگوں کا نہایت نمایاں اثر ہوا تھا جن کی انہوں نے سوانح عمریاں لکھی ہیں، مگر ابتک کسی نے اس کا اشارہ تک ہیں کیا۔اس مرثیہ میں خاص طور پر اس کی تصریح کی گئی ہے۔اسی مناسبت سے دفتر سیرت نبوی میں پڑھا گیا جس سے سامعین بہت متاثر ہوئے۔

(۴) پروانہ ہائے شمع خاموش یعنی فدایان شبلی

(۵) مراد شیخ عبدالقادر جرجانی امام فن ادب

(۶) مراد ہے کعبہ شریف سے

(۷) یہ واقعہ ہے کہ مولانا نے آخر وقت میں زبان مبارک سے یہی الفاظ فرمائے تھے۔اسی بنا پر خدا کی ذات سے امید ہے کہ آپ کا خاتمہ بالخیر ہوگا،جیسا کہ مولانا نے خود فرمایا ہے۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

(۸) جیسا کہ حالی مرحوم فرماتے ہیں۔

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحید عصر ویکتائے زمن دیکھو

اس مرثیہ کے آخر میں حیرت نے اپنے ایک خواب کو نظم میں ڈھالا ہے۔اس کا پہلا عنوان پیام شبلی ہے،جس میں کچھ نثر میں وضاحت کی ہے،پھر جلوہ خواب کے عنوان سے اپنے احساسات رقم کئے ہیں۔انہیں یہاں ہو بہو نقل کیا جاتا ہے۔

پیام شبلی

مابقی النبوات الاالمبشرات

زمانہ قدیم سے نسیم سحر نے عشاق کو بارہا مژدہ ہائے جاں فزا سنائے ہیں۔کبوتران نامہ

بر نے ہزاروں بار پیغام بری کی ہے اور دور جدید میں تار کے سلسلوں نے مشرق ومغرب کے فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے صداہائے منتشرہ کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ آہ! ان میں وہ معجزہ، وہ جادو، وہ سحر کہاں جو معشوق کے لب جاں فزا کی اس حرکت میں ہے۔ جو گوش عاشق کے اعصاب کو موج ہائے کوثر و تسنیم میں غوطہ دے کر خود گم ہو جاتی ہے۔ یہ مرثیہ، یہ نوحہ، یہ واقعہ جاں سوز اسی قسم کے معجزانہ سحر کاریوں کا ایک طلسم، اسی قسم کی برقی حرکت کی ایک رو، اسی قسم کی صداہائے پنہاں کی ایک آواز بازگشت ہے، جس کو مسیح نے چرخ چہارم سے سنایا اور اس کو عذرا نے سنا۔ یہ خواب اگر چہ ایک راز تھا لیکن عاشق رسوا میں اس قدر ضبط کہاں کہ وہ راز کو چھپائے۔ بالخصوص جب کہ معشوق چرخ چار میں سے اس کی دلجوئی کے لئے (شبلی منزل) میں آئے۔ عام تعلقات قدیمہ کی یاد تازہ کرائے۔ احباب اور تلامذہ کا ایک گلدستہ مرتب کرے اور ہر ایک کے لئے نظام عمل بتائے۔ ہر ایک کے لئے آنکھوں سے آنسو پوچھے اور اپنے اعمال جلیلہ کے زندہ رکھنے کی وصیت فرمائے۔ ایک راز، ایک سر مکتوم، ایک مکتوب مہر بند، ایک پیام پنہاں ہے۔ مگر سینہ تنگ میں ان ودیعت ہائے گراں قیمت کی وسعت کہاں، اس لئے کچھ تو موتی آنسو کے ساتھ بہہ کے کچھ اشرفیاں نالہائے آہن گداز سے پگھل گئیں اور کچھ بچا بچایا خزانہ رہ گیا ہے اس کو اس نظم زریں کے ذریعہ سے نذر عام کرتا ہوں مگر مقصود گوہر افشانی نہیں بلکہ اشک افسانی ہے۔ (حیرت)

جلوہ خواب

شبلی منزل [۱] پہ سراسیمہ جو اک دن پہنچا — فاتحہ پہلے تو مخدوم کی تربت پہ پڑھا
بعد ازاں اس کے تصور میں بہ سینہ افگار — دل محزوں کی طرح بیٹھ گیا قرب مزار
ہوئے پھر دل میں دو پہلوئے مخالف پیدا — فرحت انگیز تھا ایک، دوسرا وحشت افزا
اس کے وصفوں کے تصور میں تھا دل باغ و بہار — اور جدائی کے تصور سے دل وسینہ فگار
ٹیس پہلو میں الگ دل میں جدا ایک کسک — دفعتاً شدت غم سے گئی آنکھ اپنی جھپک
دل سے اس وقت یہ دل سوز نکلتی تھی صدا — ہائے رے چرخ ادب کے مرے شمس العلماء

اتنے میں مرد مسافر[۲] مجھے ایک آیا نظر
از رہے لطف کہا اس نے کہ اے خستہ جگر

کس کا ماتم ہے یہ کیا سوگ ہے کیوں روتے ہو
کس کی تم یاد میں اس طرح جی کھوتے ہو

ہاں سنیں ہم بھی کہ وہ کون ہے شمس العلماء
جس کے ہے عشق ومحبت میں جنوں وسودا

کیا تعلق تھا ترے دل میں ہے وحشت کیسی
تیرے چہرہ سے برستی ہے یہ حسرت کیسی

کس کے تم عشق ومحبت میں ہوئے ہو بے حال
کچھ مجھے اپنا سناؤ تو مفصل احوال

کس پہ شیدا ہو سنیں نام تمہارا کیا ہے
آج کل شغل ہے کیا کام تمہارا کیا ہے

کیا کہوں شدت غم سے تو جی ہے میرا نڈھال
ہوگیا دہر سے پنہاں مہ رخشاں کمال

سو رہا خاک میں ہے آج وہ رشک جہاں
جس کے خورشید بلاغت سے چمکتا تھا جہاں

اٹھ گیا آج وہ دنیا سے ہمارا مخدوم
جس کے ہر فضل کی تھی عرش بریں تک اک دھوم

کیا کہوں دل پہ جو کچھ رنج وپریشانی ہے
ماتم حاشہ شبلی نعمانی ہے۔

تھا ہر اک فضل وکمالات کا وہ اک مخزن
چاند سورج کی طرح دہر میں تھا وہ روشن

آہ وہ قوم کے بیڑے پر تباہی آئی
ملک روتا ہے عجب غم کی گھٹا ہے چھائی

لٹ نہ جائے ہنر وعلم کی دولت ایسی
کبھی اللہ دکھائے نہ مصیبت ایسی

نسبتیں جو کہ ہیں وابستہ بتاتا ہوں میں
لو سنو تم کو یہ تصریح سناتا ہوں میں

ایک تو کنبہ آقا کا معلم[۳] ہوں میں قدیم
ماسوا اس کے ہوں شاگرد رشید اور ندیم

اس کے الطاف وتوجہ کا جو ایما دیکھا
اپنے مخدوم کی خدمت میں علی گڑھ[۴] پہنچا

واں رہا خدمت آقا میں بصد شوق وامید
شغل تھا تربیت حامد وتعلیم جنید

واں میں تلمیذ بھی تھا بچوں کا استاد بھی تھا
یعنی شاگردی استاد سے دل شاد بھی تھا

چشمہ علم سے اس کے مجھے وہ فیض ملا
مہر تعلیم سے جس کے یہاں آکر چمکا[۵]؟

اسی خورشید کا اک ذرہ رخشاں میں ہوں
اور اسی ابر کا ایک قطرہ نیشاں میں ہوں

نقل کرتا تھا بصد شوق وہاں الفاروق
سب ادا کرتا تھا آقا کی میں خدمات و؟؟

جب کہ وہ از رہ الطاف بلاتا تھا مجھے
چٹکلے علمی وہ دل چسپ سناتا تھا مجھے

خضر کی طرح رہ راست دکھاتا تھا مجھے　　نکتہ ہر فن کا دل آویز سکھاتا تھا مجھے
ایسا پردرد جگر سوز ہے نالہ میرا　　شق کلیجہ ہو جو سن لے کوئی نوحہ میرا
نام کیا پوچھتے ہو عاشق گم نام ہوں میں　　چمن دہر میں اک بلبل ناکام ہوں میں
یوں تو سب بندہ رحمانی [۶] مجھے کہتے ہیں　　عاشق شبلی نعمانی مجھے کہتے ہیں
درگہہ حضرت والا کا میں خادم بھی ہوں　　اسی اسکول [۷] کا میں ایک ملازم بھی ہوں
شدت غم سے کسی وقت جو گھبراتا ہوں　　مرقد حضرت آقا پہ چلا آتا ہوں
گرد اس مدفن اخفر کے پھرا کرتا ہوں　　روز شب نالہ وفریاد کیا کرتا ہوں

حواشی:

[۱]　یعنی منزل اولیں وآخریں جناب مولانائے مرحوم۔

[۲]　مراد مولانا سید سلیمان صاحب تلمیذ رشید و جانشین مولانائے مرحوم۔

[۳]　مصنف کا خاندان عرصہ دراز سے علوم وفنون کا مرکز، اطراف وجوانب کے شرفا کی تعلیم وتعلم کا مرجع ہے۔ اس بنا پر علامہ مرحوم کے خاندان کے ساتھ مدت سے علمی تعلق رہا ہے۔

[۴]　علامہ مرحوم نے مجھ کو بزمانہ پروفیسری مدرسۃ العلوم علی گڑھ بذریعہ معلم عزیزان حامد و جنید طلب فرمایا تھا۔ یہ اشارہ اسی طرف ہے۔

[۵]　خاکسار جب علی گڑھ سے مولانا کی طرز تعلیم سے واقف ہو کر آیا تو اعظم گڑھ میں میری طرف عام رغبت کا اظہار کیا گیا۔

[۶]　خاکسار کے نام یعنی عبدالرحمٰن کا ترجمہ ہے جو بضرورت شعر میں لایا گیا ہے۔

[۷]　نیشنل اسکول جس کو مولانائے مرحوم نے خود قائم کیا تھا اور اب اس کا نام مسلم جارج اسکول ہے۔ (قاضی عبدالرحمٰن حیرت)

حیرتؔ صاحب کا دارالمصنّفین اور اس کے ارباب حل وعقد سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ ان کے تقریباً تمام کتب ورسائل مولوی مسعود علی ندوی مہتمم دارالمصنّفین کے اہتمام میں معارف پریس

سے شائع ہوئے۔ ان کی ایک نظم جو انھوں نے شبلی منزل پر لکھی ہے اور جو ماہنامہ معارف میں شایع ہوئی ہے، اس سے ان کی شبلی اور دبستان شبلی سے دلی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے:

شبلی منزل

آج آفاق میں مشہور ہے شبلی منزل — علم کے نور سے معمور ہے شبلی منزل
گوشہ گوشہ میں ہے اس جائے مقدس کی جودھوم — اس لئے قبلہ جمہور ہے شبلی منزل
سیکڑوں کوس سے آتے ہیں زیارت کیلئے — سامنے شوق کے کیا دور ہے شبلی منزل
جلوہ طور کے مشتاق کہاں جاتے ہیں — آئین یاں شمع سرطور ہے شبلی منزل
کیسے کیسے ہیں یہاں جمع سلیمان زماں — رشک کاشانہ فغفور ہے شبلی منزل
اک طرف دیکھو تو ہے دار مصنف قایم — آج کل علم کا گنجور ہے شبلی منزل
ایک طرف سیرت نبوی کا جدا ہے دفتر — تابش نور سے پرنور ہے، شبلی منزل
منزل شبلی سے ہوتا ہے معارف شایع — اس لئے اور بھی مشہور ہے، شبلی منزل

○○○

[۸]

مسافران شبلی منزل

(عہد شبلی و سلیمان)

موضع بندول کے علاوہ اعظم گڑھ شہر میں علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے تین مکانات تھے۔ پہلا مکان جسے کوٹھی کہنا چاہئے شہر میں چوک کے قریب محلّہ کرمی ٹولہ میں واقع تھا۔ اس گھر میں خانوادۂ شبلی عرصہ تک آباد رہا اور اب بھی علامہ شبلی کے چچازاد بھائی محمد عثمان [کوتوال الہ آباد] کا خانوادہ آباد ہے۔ محمد عثمان ایم اے او کالج علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہاں سے ایف اے پاس کیا۔ انہیں علامہ شبلی نے اپنے ساتھ رکھ کر علی گڑھ میں تعلیم دلائی تھی۔ ''مکاتیب شبلی'' میں ان کا نام متعدد جگہوں [اول:۵۵، ۶۱، ۷۱، ۷۲، ۷۷، ۹۸، ۳۳۶] ملتا ہے۔

یہ کوٹھی محمد عثمان کے ورثا نے حال میں مسمار کر کے جدید تعمیرات کرائی ہیں۔ یہ کوٹھی جب آباد اور پر رونق تھی، اسے ''شبلی ڈیرا'' بھی کہا جاتا تھا۔ علامہ کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل [م:۱۲/نومبر ۱۹۰۰ء] اسی مکان میں قیام کرتے تھے اور اسی میں رہ کر وکالت کیا کرتے تھے۔ علامہ شبلی کا بچپن اور جوانی کا زمانہ اسی مذکورہ کوٹھی میں گذرا۔ ایک زمانہ میں یہ شعر وادب کا گہوارہ تھی۔ شعرا بالخصوص شہر اعظم گڑھ کے شعرا یہاں جمع ہوتے اور دادِ سخن دیتے۔ ایک شاعر سید عابد حسین عابدؔ جونپوری کے غیر مطبوعہ مجموعہ کلام کی جن غزلوں پر برمکان شبلی یا برمکان شیخ حبیب اللہ اعظم گڑھ لکھا ہوا ہے، وہ غزلیں اسی کوٹھی میں پڑھی گئی تھیں۔ اسے ناچیز نے بھی دیکھا ہے۔ افسوس کہ اب اس کوٹھی کی کوئی تصویر بھی محفوظ نہیں ہے۔

علامہ شبلی کا دوسرا مکان محلّہ پہاڑ پور میں لب سڑک اور شبلی کالج کے بالمقابل واقع

ہے۔ یہ دراصل علامہ شبلی نعمانی کی دوسری غیر کفو والدہ کی رہائش گاہ تھی۔ جہاں وہ اپنے اکلوتے فرزند محمد اور پوتے مظفر کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ ''مکاتیب شبلی'' میں چھاؤنی کا جو ذکر ملتا ہے وہ دراصل اسی مکان اور انہی خاتون کی طرف اشارہ ہے۔ اسے ورثا نے فروخت کر دیا ہے۔ البتہ نام ونشاں بلکہ ایک حصہ ابھی باقی ہے۔

علامہ شبلی نے ۱۸۹۵ء میں اپنی والدہ مرحومہ [مقیمہ بی بی] جو پھریہا کے حاجی قربان قنبر انصاری کی صاحبزادی تھیں کے انتقال کے بعد اعظم گڑھ شہر میں دو اور مکانات تعمیر کرائے۔ ایک اپنی والدہ مرحومہ کی یاد میں جسے ''صدر المنازل'' کا نام دیا اور جو شبلی نیشنل پی جی کالج میں اب تک باقی ہے۔ دوسرا مکان اپنی رہائش کے لئے تعمیر کرایا اور جسے عرف عام میں ''شبلی منزل'' کہا جاتا ہے۔ اسی شبلی منزل کو انہوں نے دار المصنّفین کے لئے منتخب کیا اور اس سے ملحق زمینیں بھی اس پر وقف کیں۔ دار المصنّفین کا موجودہ وسیع و عریض اور شاندار کتب خانہ دراصل شبلی منزل کی اصل عمارت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصلاً اب بھی یہی ''شبلی منزل'' مرکز شبلی ہے۔ یہیں سے ان کی یادوں اور فکر ونظر کا کارواں دنیا بھر میں رواں دواں ہوتا ہے۔ خدا اسے محفوظ اور آباد رکھے۔

سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد مئی ۱۸۹۸ء میں علامہ شبلی نے علی گڑھ کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دیا اور اپنے وطن اعظم گڑھ چلے آئے۔ اس باران کا قیام اسی شبلی منزل میں رہا۔ یہیں سخت بیمار ہوئے تو عیادت کے لئے علی گڑھ سے نواب محسن الملک تشریف لائے اور اسی مکان میں تین دن ٹھہرے۔ اسی مکان سے تبدیلی آب وہوا کے لئے وہ کشمیر گئے اور قصیدہ کشمیریہ کہا جو کلیات شبلی میں ان کی اہم تخلیقات میں شامل ہے۔ حتیٰ کہ سوانحی ادب کا شاہ کار ''الفاروق'' بھی اسی مکان میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔

۷ارمئی ۱۹۰۷ء کو حادثہ گزندپا کا واقعہ اسی شبلی منزل میں پیش آیا تھا۔ اس کی تفصیل علامہ شبلی کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ وہ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''ایک اتفاقی تقریب سے میں اپنے وطن اعظم گڑھ میں آیا تھا اور ارادہ تھا کہ مہینہ دو مہینہ یہاں قیام کروں گا۔ شعر العجم کے اجزا زیر تحریر تھے اور

شاہنامہ پر ریویو کر رہا تھا۔ سترہویں مئی ۱۹۰۷ء قریباً دس بجے ہوں گے کہ میں دفتر سے اٹھ کر زنانہ کمرے میں گیا۔ اندر تخت بچھے ہوئے تھے۔ پاؤں لٹکا کر تخت پر بیٹھ گیا۔ تخت پر کارتوس بھری ہوئی بندوق رکھی تھی۔ میں نے ہاتھ میں اٹھالی اور پھر ایک دوسرے شخص (بہو) کے ہاتھ میں دیدی۔ اتفاق سے گھوڑا اگر گیا۔ بندوق کی زد ٹھیک میرے پاؤں پر تھی۔ بندوق کی نال سے پاؤں تک صرف ایک بالشت کا فاصلہ تھا۔ کارتوس میں اگرچہ چھرے تھے لیکن چونکہ بڑے تھے اور فاصلہ بہت کم تھا، اس لیے ٹخنے کی ہڈی بالکل چور ہوگئی اور پاؤں کٹ کر صرف دو تسمے لگے رہ گئے۔ جس وقت ضرب لگی مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ پاؤں کو ایک جھٹکا سا لگا، کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوئی۔ جھٹکے کے بعد بندوق کے چھوٹنے کی آواز محسوس ہوئی، اس وقت میں نے گھبرا کر کہا یہ کیا ہوا۔ آواز سن کر باہر سے بعض آدمی اندر آ گئے۔ اس وقت میں اسی طرح پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا اور پاؤں جوتے میں تھے۔ ایک عزیز نے آ کر میرے پاؤں پر ہاتھ رکھا تو میں نے پاؤں جوتے میں سے نکال لیا۔ اس وقت پاؤں کی ایڑی جوتے میں پھنس کر رہ گئی۔ میں نے پاؤں اوپر اٹھایا اور نوکروں سے کہا اس پر پانی ڈالو۔ پانی جب ڈالا جاتا تھا تو پاؤں میں سے بھک بھک دھواں نکلتا تھا۔ قریباً پاؤں گھنٹہ تک پاؤں اٹھائے بیٹھا رہا۔ جب پنڈلیاں دکھنے لگیں تو میں نے آدمی سے کہا کہ اب ایک تکیہ لا کر میرا پاؤں اس پر رکھ دو۔ آدمی نے رو کر کہا کیا چیز ہے جو رکھی جائے گی۔ مجھ کر اس وقت تک نہ معلوم تھا کہ میری ایڑی جدا ہو کر جوتے میں رہ گئی ہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ابتدا میں ایک فوری نظر کے سوا مطلق اپنے پاؤں پر نظر نہیں ڈالی اور جو کچھ میں نے پاؤں کے متعلق حالات بیان کیے ہیں وہ ڈاکٹر اور دیگر حاضرین کی زبانی ہیں۔

اس وقت خاص عزیزوں میں سے کوئی نہ تھا۔نوکراور ماماوغیرہ تھیں۔ یہ لوگ سخت زاروقطار روتے تھے اور میں ان کو منع کرتا تھا۔قریباًایک گھنٹہ کے بعد فرزندعزیزمحمد حامد آیااورزخم کو دیکھتے ہی چیخ اٹھااور بہت بےقراری کے ساتھ گریۂ وزاری کرنے لگا۔تھوڑی دیر کے بعد اس پرغشی سی طاری ہوگئی۔میں نے نوکروں سے کہا کہ اس کے منھ پر پانی چھڑکواورحلق میں پانی ٹپکاؤ،اس سے اس کو ہوش آ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے چھوٹے عزیزی بھائی جنید،سول سرجن اوراسسٹنٹ سوسل سرجن کوساتھ لے کرآئے۔بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ جو رگیں کٹ گئی تھیں ان سے شدت کے ساتھ خوج جاری تھااور نہ خود مجھ کواور نہ نوکروں چاکروں میں کسی کو خیال آیا کہ ان پر پٹی کس کر باندھ دیں جس سے خون رک جائے۔

بہرحال ڈاکٹر نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ رگوں کے منھ باندھ دئے جس سے خون رک گیا۔اس کے بعد میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ اگر پاؤں جوڑنے کے قابل ہوتو خیر ورنہ سرے سے نکال ڈالئے۔ڈاکٹر نے کہا کہ پاؤں کاٹے کے بغیرکوئی چارہ نہیں۔غرض بے ہوشی کی دواپلائی گئی اور عمل جراحی شروع کیا، چونکہ ہڈیاں کچھ اوپر تک پھٹ گئی تھیں، اس لیے نصف پنڈلی جدا کردی گئی۔(اور متصل ہرزہ گردی کی سزادی گئی۔)عمل جراحی کے پورے ہونے کے دس پندرہ منٹ بعد مجھے ہوش آیااورزخموں کے ٹانکے اوررگوں کی کھچاوٹ کی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔آج نواں دن ہے، ڈاکٹر ایک دن بیچ دے کر زخم کھولتا ہے، دھوتا ہے اور پھر باندھ دیتا ہے۔ تکلیف میں ابھی تک کوئی کمی نہیں ہے،لیکن خدا کا شکر ہے کہ ابتدائے واقعہ سے اس وقت تک طبیعت کی طمانیت اورسکون میں کوئی کمی نہیں ہے۔سوچتا

ہوں تو نظر آتا ہے کہ جو شخص سر کاٹے جانے کے قابل ہو اس کے پاؤں کاٹے گئے تو کیا ہوا؟

ظاہری حالات کے لحاظ سے بھی تسکین ہے کہ پچاس برس سے بھی زیادہ کی کچھ عمر پائی۔ بہت چلا پھرا، دوڑا دھوپا، ملا جلا، آخر کہاں تک؟ خود پاؤں توڑ کر بیٹھنا چاہیے تھا، نہ بیٹھا تو قسمت نے بیٹھا دیا۔ گر نستانی بہ ستم میر

خدائے بے نیاز کا شکر گذار، احباب و اعزہ کا منت پذیر ہوں، بچ گیا تو پھر کسی نہ کسی طرح دوستوں کو دیکھ لوں گا، ورنہ ان شاء اللہ تعالیٰ اب دوسرے عالم میں ملاقات ہوگی۔ والسلام

دسویں دن ٹانکے کھولے گئے، ایک ٹانکے میں مواد آ گیا، اس وجہ سے سوزش اور ٹپک کی سخت تکلیف ہے۔ ۳۱ر مئی ۱۹۰۷ء تک یہ حالت ہے۔

شبلی نعمانی

۲۵ر مئی ۱۹۰۷ء

(مکاتیب شبلی ج ا ص ۱۵۵-۱۵۶)

اس حادثہ پر عیادت کے لئے نواب سید علی حسن خاں، مولانا سید عبدالحی حسنی اور مولوی عبدالحلیم شرر وغیرہ لکھنو سے تشریف لائے جو اسی شبلی منزل میں مقیم ہوئے۔ اسی طرح ۱۹۱۳ء کے آخر میں جب علامہ شبلی ندوہ سے مستعفی ہو کر اعظم گڑھ آئے تو بھی اسی شبلی منزل میں ان کا قیام رہا۔ اس زمانہ میں مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کی انتظامیہ کے بعض جلسے بھی اسی شبلی منزل میں منعقد ہوئے۔

علامہ شبلی نعمانی جب یہاں قیام کرتے تو ان کے احباب ملاقات کے لئے شبلی منزل آیا کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ عہد شبلی اور اس کے بعد کے ادوار میں ہندوستان کے مشاہیر اہل علم و ادب اسی شبلی منزل میں قیام کرتے تھے، لیکن جب علامہ نے شبلی منزل اور اس سے متصل اپنے دو باغوں کو دارالمصنّفین پر وقف کیا اور شبلی منزل کے مشرقی حصہ میں ایک وسیع و عریض مہمان خانہ

تعمیر کرایا تو پھر مہمانوں کا قیام اس نئے مہمان خانہ میں ہونے لگا۔ دارالمصنّفین کا موجودہ تاریخی مہمان خانہ اسی قدیم مہمان خانہ کی جگہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی نے ۱۹۲۷ میں تعمیر کرایا ہے۔

عہد شبلی سے آج تک شبلی منزل اور اس کا مہمان خانہ دنیا بھر کے اہل علم و ادب اور ارباب کمال کی مختلف النوع یادوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ بعد میں یہی مہمان خانہ ملک کے سیاسی رہنماؤں اور آزادی کے متوالوں کی آماجگاہ اور ان کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ زیر نظر مقالہ میں ان مسافران شبلی منزل کے چند نفوس کی یادوں کے ذکر پر مشتمل ہے جو عہد شبلی و سلیمان میں اعظم گڑھ تشریف لائے اور شبلی منزل میں ٹھہرے۔ مزار شبلی پر فاتحہ پڑھنے یا کتب خانہ سے استفادہ کرنے کے مقصد سے ملک و بیرون ملک کے بے شمار لوگوں نے یہاں کا سفر کیا۔ اب ایک صدی بعد اس ادارہ یعنی دارالمصنّفین کی حیثیت ایک تاریخی اور سیاحتی مقام کی ہوگئی ہے۔ بعض اشخاص آج بھی اس حیثیت سے دارالمصنّفین دیکھنے آتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسے اہل علم میں بیت الحکمت خیال کیا جاتا ہے اور اسی وقار کی بنا پر تمام اہل کمال یہاں آتے اور قیام کرتے ہیں۔ اور ان بزرگوں کو جنھوں نے اسے قائم کیا اور جنھوں نے معمولی معمولی تنخواہوں میں اس ادارہ پر اپنی زندگیاں نچھاور کردیں انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

دارالمصنّفین کی ایک صدی کی تاریخ میں ہندوستان کے بے شمار مشاہیر ملک وملت اس سے کسی نہ کسی حیثیت (انتظامیہ کے صدر، نائب صدر، رفیق، اعزازی رفیق اور ارکان انتظامی) سے وابستہ رہے، جیسے مولانا حمید الدین فراہی، علامہ سر محمد اقبال، مولوی اقبال احمد خاں سہیل، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریہ ہند، فخرالدین علی احمد صدر سابق جمہوریہ ہند، مرزا احسان احمد، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا سید ریاست علی ندوی، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی وغیرہ۔ زیر نظر مقالہ میں ان عہدہ داران دارالمصنّفین کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اس لئے کہ ان کا تذکرہ دارالمصنّفین کی تاریخ اور خدمات پر لکھی جانے والی مستقل کتابوں میں آ گیا ہے۔

مذکورہ بالاشخصیات کے علاوہ ہندوستان اور برصغیر کے دیگر مما لک کے مشاہیر اہل علم و ادب، سیاست داں، ماہر تعلیم اور دیگر ارباب علم وکمال کی ایک بڑی اور نمایاں تعداد ایسی ہے، جس نے دارالمصنّفین سے مدۃ العمر ربط وتعلق قائم رکھا اور اس کی زیارت کے لئے اعظم گڑھ کا سفر کیا۔ اس میں ہندو ومسلمان دونوں شامل ہیں۔مسلمان مشاہیر کے نام یہ ہیں:

مولوی مہدی علی خاں نواب محسن الملک، مولوی اعجاز حسن خاں، مولوی ریاض حسن خاں خیاؔل، مولوی عبدالحلیم شرر، نواب سید علی حسن خاں، بی اماں، مولانا ظفر علی خاں ، چودھری خلیق الزماں، مفتی کفایت اللہ دہلوی، آصف علی فیضی، قاضی عدیل عباسی ، مولوی جواد علی، مولانا سید عبدالحی حسنی، مولوی عبدالرزاق کان پوری، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا موسیٰ جاراللہ (روس)، سرورخاں گویاؔ (ملک الشعراء افغانستان)، شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جون پوری، جمال پاشا (ترکی)، ابراہیم حمدی (سعودی عرب)، ڈاکٹر عبداللہ عمر النسیف (مصر) رفیع احمد قدوائی، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر محمد حمید اللہ پیرس، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، رشید احمد صدیقی ، سجاد انصاریؔ، اثر لکھنوی، سید نجی احمد ہاشمی، کیفی اعظمی اور سید حامد وغیرہ

اسی طرح ہندو مشاہیر کے نام یہ ہیں:

راشٹر پتا مہاتما گاندھی، پنڈت مدن موہن مالویہ، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، سی پی گپتا، اشوک مہتہ، بی گوپال ریڈی، سوچیتنا کرلانی ، رام بہادر سکسینہ، سرتیج بہادر سپرو، ڈاکٹر سمپورنانند، پنڈت مدن موہن مالویہ، آچاریہ نریندر دیو، جے پرکاش نرائن، رام منوہر لوہیا، پنڈت ونوابھاوے، لال بہادر شاستری سابق وزیر اعظم، اندرا گاندھی سابق وزیر اعظم، تاریخ ادب اردو کے مصنف رام بابو سکسینہ، فراق گورکھپوری، سروجنی نائیڈو، چودھری چرن سنگھ سابق وزیر اعظم، مشہور محقق مالک رام، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، گلزار دہلوی، وی پی سنگھ سابق وزیر اعظم وغیرہ

مذکورہ شخصیات اور ان کے اسفار کا اگر ذکر کیا جائے تو مسافران شبلی منزل پر ایک بہت

ہی ضخیم اور مبسوط کتاب تیار ہوجائے گی۔اسے کسی اہل قلم کو ضرور لکھنا چاہئے۔ہم نے اس مقالہ میں محض ان اہل علم اور ارباب کمال کا ذکر کیا ہے جو علامہ شبلی یا سید صاحب سے ملاقات کے لئے شبلی منزل آئے اور روز دو روز ٹھہرے۔

عہد شبلی

ا۔نواب محسن الملک

شبلی منزل اعظم گڑھ میں قیام کرنے والوں میں پہلا نام علامہ شبلی نعمانی کے دوست نواب محسن الملک [۱۸۳۷-۱۹۰۷ء] کا ہے۔سر سید احمد خاں ان سے پہلے ۱۱/ جولائی ۱۸۷۴ء کو اعظم گڑھ تشریف لائے تھے،مگر اس وقت شبلی منزل تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ان کا قیام غالباً سرکاری بنگلے میں صاحب توبۃ النصوح مولوی نذیر احمد دہلوی [۱۸۳۶-۱۹۱۲ء] ڈپٹی کلکٹر اعظم گڑھ کے یہاں ہوا تھا۔

پروفیسر اقبال حسین صاحب سابق استاد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۲۰۰۷ء میں نواب محسن الملک سے متعلق منتشر کاغذات کا ایک مجموعہ ''دستاویزات محسن الملک'' کے نام سے شائع کیا ہے۔اس میں ایک دستاویز (نمبر ۱۷،شمار نمبر ۱۶۷) ''خط طلبائے اعظم گڑھ'' کے نام سے درج ہے۔عنوان سے بظاہر یہ معلوم ہورہا ہے کہ ایم اے او کالج علی گڑھ میں مقیم طلبائے اعظم گڑھ کا یہ کوئی خط ہے جو انہوں نے نواب محسن الملک کے نام لکھا ہے،مگر دراصل یہ طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ کا وہ سپاس نامہ ہے جو انہوں نے نواب محسن الملک کی اعظم گڑھ آمد پر علامہ شبلی کی موجودگی میں ان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔اس پر چونکہ ۲۳/ مارچ ۱۸۹۹ء کی تاریخ درج ہے، اس لئے یہ واضح ہوتا ہے کہ نواب صاحب جنوری ۱۸۹۹ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ کے سکریٹری منتخب ہونے کے بعد مارچ ۱۸۹۹ء میں اعظم گڑھ تشریف لائے تھے۔چوں کہ علامہ شبلی کے ایک خط میں نواب محسن الملک کے قیام اعظم گڑھ کی مدت تین دن لکھی ہوئی ہے،اس لئے اس کی تعیین

۲۱/۲۲/ مارچ سے ۲۴/۲۵/ مارچ ۱۸۹۹ء کی تاریخوں کے درمیان کی جاسکتی ہے۔

اس سپاس نامہ کو اصل سے نقل کرنے میں ''دستاویزات محسن الملک'' کے مرتب نے احتیاط سے کام نہیں لیا ہے۔ کمپوزنگ کی متعدد غلطیاں صاف طور پر دکھائی دیتی ہیں، حتیٰ کہ اس دستاویز کی تاریخ کے اندراج میں بھی کئی فاش غلطیاں مرتبین سے سرزد ہوئی ہیں۔ چار صفحے کے اس سپاس نامہ کے پہلے صفحہ پر ۲۳/ اپریل ۱۸۹۸ء کی تاریخ درج ہے اور بقیہ صفحات میں ۲۳/ اپریل ۱۸۹۹ء۔ اصل سپاس نامہ کے اختتام پر ۲۳/ مارچ ۱۸۹۹ء ہی کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ سپاس نامہ پیش کرنے کی اصل تاریخ یہی ہے۔

طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ کا یہ سپاس نامہ یقینی ہے کہ علامہ شبلی کی ایما ہی سے پیش کیا گیا ہوگا۔؟ اس کے مواد اور مشمولات سے بھی اس کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ بہر حال یہ سپاس نامہ اپنے مشمولات کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

> ''معلیٰ القاب جناب نواب محسن الملک صاحب!
>
> ہم طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ جو عالی جناب شمس العلما مولانا محمد شبلی صاحب کی ایک ادنی شعاع فیض و ضیاء مکرمت ہے اور جس کی تمام رفعت و ترقی مولانا ممدوح کی ہمدردی و روشن ضمیری کے خیالات سے وابستہ ہے، نہایت ادب سے دلی جوش کی شادمانی و اٹھتے ہوئے جوش دل کے دلوں کے مسرت سے اس مبارک اور قابل فخر موقع پر جب کہ حضور عالی کے کوکب ہمایوں کے ورود نے اس سرزمین کو فلک چہارم کی عزت دی یا یوں کہئے کہ جناب شمس کی عیادت کی تقریب سے خورشید درخشاں نے قدم رنجہ فرمایا کہ اس سے ہمارے مرز بوم کے ہر خار و خس کو رتبہ انا الشرق عطا کیا ہے۔ چند سطور حضور عالی کے قومی خدمات کے متعلق عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔'' (دستاویزات محسن الملک ص ۳۴۷)

بعد ازاں ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات بالخصوص مسلمانوں کی زبوں حالی اور کسمپرسی کا

تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بے بسی بیان کی گئی ہے اور یہ خوف ظاہر کیا گیا ہے کہ مسلمانان ہند اسپین کے مسلمانوں کی طرح کے حالات کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ایسے میں رحمت حق نے دوسیدوں کو پیدا کیا۔ پھر پہلے سید سرسید احمد خاں کی کاوشوں کا ذکر ہے۔ بعد ازاں دوسرے سیدزادے یعنی نواب محسن الملک کی شخصیت اوران کے فضل وکمال کا بیان ہے۔اس میں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ سرسید کی وفات کے بعد خوف تھا کہ تحریک علی گڑھ کہیں پژمردہ نہ ہوجائے،مگر نواب محسن الملک کی ذات گرامی سے یہ خوف جاتا رہا۔اصل عبارت یہ ہے:

> ''خلدآشیاں سید مرحوم کی وفات بے وقت و ناگہانی سے ہم بچگان اسلام کو اسلامی اوج وشان کی ترقی کی طرف سے ایک قسم کی مایوسی ہوگئی تھی، آپ کے قابل تعظیم قوت بازو کی ٹوٹنے سے ہم سخت متوحش تھے کہ مبادا ترقی کے ذرائع رک جائیں اور وہ قابل فخر مدرسہ سرچشمہ علم ومعدن فنون محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ جوغفرلہ سرسید مرحوم کی کوششوں کا ثمرہ ہے، اس کی روانی وطراوت اوراس کے ارکان ووصول تعلیم میں کوئی ناخوش گواری وڈھیل واقع ہواوراسلامی جماعت کا کوئی حامی ومعین نہ رہے،مگر خدا کا شکر ہے کہ ہماری مایوسی خوشی سے بدل گئی اور یہ بات اب علانیہ نظر آرہی ہے کہ قابل تعظیم مرے والا اپنے مرتے وقت ودیعۃً اپنے تمام دست و بازو کی قوت، اپنی تمام دلی روشنیاں وروشن ضمیریاں،اپنے تمام متبرک اوصاف وبرکات کو حضرت مہدی کے تمام برگزیدہ شمائل،زورآوردست وبازو،مستقل جدوجہد، نورانی دل مصفا وروشن دماغ پراضافہ کرتا گیا ہے،جس کے قابل عظمت و سرگرم کوشش سے یہ صریح آشکار ہے کہ سید مرحوم کی کوششوں سے جو پودلگی تھی وہ جلد تناور درخت ہوگی اوراس کے ثمر سے انشاءاللہ ایک عالم بہرہ مند و فیض یاب ہوگا اوراس درس گاہ سے جوآپ کے صدقہ محنت میں جو یونیورسٹی بننے والی ہے وہ چشمہ فیض جاری ہوگا کہ مسلمانان ہند کے علمی خزاں خوردہ

باغ میں ہمیشگی کی بہار آوے گی۔''

(دستاویزات محسن الملک، ص: ۳۴۸-۳۴۹)

اس سپاس نامہ کا آخری پیراگراف نواب محسن الملک کے لئے دعائیہ کلمات اور نیک خواہشات پر مشتمل ہے۔ نیز طلبائے شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ کا علی گڑھ سے والہانہ تعلق کا ایک مظہر ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہم کو آپ کی ہر تمام کوشش و مدرستہ العلوم کے ساتھ نسبتاً دلی ہمدردی ہے۔ اس طرح پر کہ گویا مدرستہ العلوم میں اس وقت تعلیم پا رہے ہیں اور حضور عالی جناب سے یہ امید رکھتے ہیں کہ ہم طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ کو بھی حضور مدرستہ العلوم کا طالب علم تصور فرمائیں۔ اب ہماری یہ دعا ہے۔ حضرات! آپ آمین کہئے کہ اے خدا، اپنے رسول پاک و نبی اکرمؐ کے طفیل میں ہمارے محسن، ہمارے حامی، ہمارے رہنما، ہمارے ناخدا جناب نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں صاحب بہادر کو جو ہمارے اعتقاد و یقین سے ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کے رہبر ہیں، خضر کی عمر اور نوح کی حیات عطا کر، وائے خدا، اے خدا ہمارے محسن الملک کی اس تکلیف راہ اور صعوبت سفر کا خیال کر کے اپنے فضل وجلال کے صدقہ میں ان کی کوششوں کو کامران اور ان کے دلی ارادوں کو کامیاب کر۔ آمین ثم آمین۔''

(ایضاً، ص: ۳۵۰)

نواب محسن الملک کی خدمت میں اس سپاس نامہ کو پیش کرنے کے لئے نیشنل ہائی اسکول یا شبلی منزل میں یقیناً کسی نہ کسی تقریب کا انعقاد ہوا ہوگا، مگر اس کی تفصیلات دستیاب نہیں ہوئیں۔ البتہ اس کے متن کے ایک جملہ سے واضح ہوتا ہے کہ تقریب یقیناً منعقد ہوئی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ میں اس کی تفصیلات شائع ہوئی ہوں۔

یہ سپاس نامہ نواب محسن الملک کو جس وقت پیش کیا گیا اس وقت علامہ شبلی ایم اے او

کالج علی گڑھ سے علاحدہ ہوکر اعظم گڑھ میں مقیم تھے اور نواب محسن الملک علی گڑھ کالج کے سکریٹری منتخب ہو چکے تھے، ممکن ہے علامہ شبلی نے اس سپاس نامہ کو نہ دیکھا ہو، مگر اس کے لکھنے میں ان کا مشورہ ضرور شامل رہا ہوگا، کیونکہ اس وقت تک علامہ شبلی کا جو تعلیمی نظریہ قائم ہو چکا تھا، اس کی بازگشت اس کے صفحات میں صاف سنائی دیتی ہے۔ مثلاً یہ اقتباس کہ

''اور خدا کی مہربانیوں سے کچھ بعید نہیں ہے کہ علی گڑھ کے سرچشمہ علوم سے لارڈ بیکن کے ساتھ حضرت امام غزالی کی روح بھی خروج کرے۔ اڈلین و میکالے کے ساتھ امام رازی و امام بخاری کی برکتیں بھی اپنا جلوہ دکھائیں۔''
(دستاویزات محسن الملک، ص: ۳۴۹)

نواب محسن الملک جس وقت شبلی منزل میں تشریف لائے علامہ شبلی اس وقت علیل تھے مگر ان کی ضیافت میں بھرپور حصہ لیا۔ اپنے چھوٹے بھائی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''پانچ چھ دن سے طبیعت اچھی ہے۔ نواب محسن الملک میری عیادت کو یہاں آئے اور میرے بنگلہ میں تین دن رہے۔ ان کی آؤ بھگت میں مجھ کو بہت چلنا پھرنا پڑا، لیکن میں اس کی برداشت کر سکا۔'' (مکاتیب شبلی ج اص ۴۱)

اس کے بعد نواب محسن الملک علامہ شبلی نعمانی سے ملاقات کے لئے ندوہ تو آئے، مگر پھر اعظم گڑھ تشریف نہیں لائے۔ گویا یہ اعظم گڑھ کا ان کا آخری سفر تھا۔

۲۔ نواب سید علی حسن خاں

بھوپال کے نواب سید صدیق حسن خاں [۱۸۳۲-۱۸۹۰ء] کے صاحبزادے نواب سید علی حسن خاں [۱۸۶۶-۱۹۳۶ء] سابق وزیر تعلیمات ریاست بھوپال علامہ شبلی کے نہایت خاص اور مخلص احباب میں تھے۔ ۱۸۹۲ میں علامہ شبلی سرسید کے ساتھ جاتے ہوئے بھوپال میں

ٹھہرے۔اس وقت نواب سید علی حسن خاں سے جو تعلقات استوار ہوئے وہ آخر تک قائم رہے۔ بھوپال میں محکمہ تعلیم کے عہدہ سے مستعفی ہوکر جب وہ لکھنو آئے تو علامہ شبلی بھی ندوہ آ چکے تھے۔ یہاں دونوں کے مراسم اور پروان چڑھے۔نواب صاحب کو بھی علامہ شبلی نے ندوہ سے وابستہ کرلیا۔بعد میں وہ ندوہ کے ناظم بھی منتخب ہوئے۔

۱۷رمئی ۱۹۰۷ء کو علامہ شبلی کے پاؤں کا حادثہ پیش آیا۔اس موقع پرنواب صاحب بھی عیادت کے لئے لکھنو سے اعظم گڑھ تشریف لائے اور شبلی منزل میں ٹھہرے۔

(حیات شبلی،ص:۴۵۲)

۳۔مولوی عبدالحلیم شررؔ

مولوی عبدالحلیم شرر[۱۸۶۰-۱۹۲۶ء] علامہ شبلی کے خاص اور عہد شباب کے احباب میں تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے تھے۔علی گڑھ میں علامہ شبلی کے یہاں اور لکھنو میں شرر کے یہاں گویا دونوں ایک دوسرے کے یہاں قیام بھی کرتے تھے۔۱۷ر مئی ۱۹۰۷ء کو پاؤں میں گولی لگنے کے واقعہ پر علامہ شبلی نعمانی کے جن احباب نے اعظم گڑھ آکر ان کی عیادت اور مزاج پرسی کی ان میں ایک مولوی عبدالحلیم شرر بھی شامل ہیں۔

(حیات شبلی،ص:۴۵۲)

واضح رہے کہ اس وقت اعظم گڑھ آنا ایک مشکل ترین مرحلہ تھا،اس لئے کہ اس وقت محض ایک لوکل ٹرین شاہ گنج سے اندارا کے لئے چلتی تھی اور اسی سے سفر کرنا ہوتا تھا۔

۴۔مولانا سید عبدالحی حسنیؒ

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی[۱۹۱۴-۱۹۹۹ء] کے والد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی

[۱۸۶۹-۱۹۲۳ء] سابق ناظم ندوہ اور صاحب نزہۃ الخواطر بھی علامہ شبلی کی عیادت کے لئے لکھنو سے شبلی منزل اعظم گڑھ تشریف لائے تھے۔(حیات شبلی،ص:۴۵۲)

بعد میں ندوہ میں اختلافات پیدا ہوئے اور دوگروہ ہوگئے۔مولانا سید عبدالحی حسنی علامہ شبلی کے مخالف گروہ میں شامل رہے اور آخر تک اسی گروہ کا حصہ رہے۔مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ''حیات سید عبدالحی''میں اس کی تفصیل لکھی ہے،مگر وہ جانبدارانہ ہے اور والد کی حمایت میں لکھی گئی ایک تحریر ہے۔

۵۔مولوی ریاض حسن خاں خیالؔ

مولوی ریاض حسن خاں خیالؔ[۱۸۷۷-۱۹۵۳ء] رئیس رسول پور مظفر پور بہار علامہ شبلی کے خاص احباب میں تھے۔مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں علامہ کے جن احباب کا نام لکھا ہے اس میں مولوی ریاض حسن خاں کا بھی نام شامل ہے۔ان سے کب تعلقات قائم ہوئے یہ تو نہیں معلوم ہوسکا۔البتہ ان کے نام علامہ شبلی کا پہلا خط ۱۸۹۹ کا مکتوبہ ہے اور آخری خط ۲۶رفروری ۱۹۱۴ء کا مکتوبہ ہے۔گویا آخر تک خط وکتابت کا سلسلہ قائم رہا۔ان مکتوبات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں میں انتہائی گہرے مراسم وتعلقات تھے۔علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ مولوی ریاض حسن رئیس مظفر پور ہمارے قدیم مخلص عنایت فرما اور قومی ضرورتوں کے نبض شناس ہیں۔

وہ اردو اور فارسی کے بڑے عمدہ شاعر تھے۔ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی نے ان کا مجموعہ ''دیوان خیال'' مرتب کرکے ۱۹۸۵ء میں بزم سخن سیتامڑھی سے شائع کرادیا ہے۔ادبیات بالخصوص فارسی ادبیات پر ان کی گہری نگاہ تھی۔علامہ شبلی جب انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے ان سے اجازت لے کر انجمن ترقی اردو کے لئے ''نامہ دانشوراں'' کا ترجمہ کیا۔ جب ترجمہ پورا ہوا تو مولوی عبدالحق انجمن کے سکریٹری تھے،انہوں نے پہلے لیت ولعل سے کام لیا،پھر خدا جانے کس طرح اسے ضائع کردیا۔اس طرح اہل علم خیالؔ کی ایک اہم کاوش سے ہمیشہ کے لئے محروم

ہو گئے۔

دسمبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ڈھاکہ میں نواب سر سلیم اللہ خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔علامہ شبلی اس میں شریک ہوئے۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے جنوری ۱۹۰۷ء میں مظفر پور ٹھہرے اور مولوی ریاض حسن خاں کے مہمان ہوئے۔ یہاں انہوں نے ایک جلسے سے خطاب کیا اور ندوہ کی ضروریات پر پرزور تقریر کی اور ندوہ کے لئے چندہ بھی کیا۔

چند ماہ بعد اسی سال ۱۷ر مئی ۱۹۰۷ء کو علامہ شبلی کے حادثہ پا کا واقعہ پیش آیا۔ اس کی تفصیل اخبارات میں شائع ہوئی تو ہر طرف صف ماتم بچھ گئی۔علامہ شبلی کے خاص خاص احباب اس موقع پر عیادت کے لئے اعظم گڑھ تشریف لائے۔ان میں مولوی ریاض حسن خاں اور ان کے بڑے بھائی مولوی اعجاز حسن خاں بھی شامل ہیں۔(حیات شبلی، ص:۴۵۲)

علامہ شبلی کے حادثہ پا پر شعرانے جو قطعات اور رباعیاں کہیں اسے ناچیز نے اپنی کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' یکجا کر دیا ہے۔

۶۔مولوی جواد علی خاں عالؔی

مولوی جواد علی خاں عالی یہ ندوہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کے ہم جماعت اور علامہ شبلی کے شاگردوں میں تھے۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''ان کا مذاق طبع خالص ادیبانہ تھا۔'' بعد میں ''خان عالی'' کے نام سے شہرت پائی۔ ماہنامہ الناظر لکھنو میں ان کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔(حیات شبلی، ص:۴۲۰)

علامہ شبلی کے حادثہ پا کی خبر سن کر مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ عیادت کے لئے خان عالؔی اعظم گڑھ تشریف لائے۔اور دو روز شبلی منزل میں ٹھہرے اور استاد کی خدمت کی۔ (حیات شبلی، ص:۴۵۲)

۷۔مولانا ابوالکلام آزاد

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد[۱۸۸۸-۱۹۵۸] کو علامہ شبلی نعمانی کی ذات سے دس بارہ سال کی عمر سے شغف تھا۔ان کی غیر معمولی لیاقت کے سبب علامہ شبلی کی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری شپ کے زمانہ میں یہ تعلق اورزیادہ ہوگیا تھا۔چنانچہ علامہ نے اسی دور میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ماہنامہ لسان الصدق کو انجمن کا ترجمان بنایا،جس سے اورقربت بڑھ گئی۔اس کے بعد بہ اصرار ماہنامہ الندوہ لکھنو کی ادارت کے لئے لکھنو بلایا۔اسی اثنا میں علامہ شبلی کی اہلیہ سخت علیل ہوئیں تو وہ اعظم گڑھ چلے آئے۔مولانا ابوالکلام آزاد لکھنو پہنچے تو مولانا حفیظ اللہ بندوی سے معلوم ہوا کہ علامہ شبلی کی اہلیہ سخت علیل ہیں اور وہ اعظم گڑھ چلے گئے ہیں۔چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد اعظم گڑھ چلے آئے۔یہاں پہنچے تو علامہ کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔مولانا آزاد ان کی تجہیز و تدفین میں شریک ہوئے۔اور ایک روز شبلی منزل میں ٹھہر کر دونوں ساتھ ہی لکھنو کے لئے روانہ ہوئے۔(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی،ص:۱۹۶-۱۹۷)

۸۔مولوی عبدالباری ندوی

علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں مولانا عبدالباری ندوی فلسفی[۱۸۸۹-۱۹۷۶ء] کا نام بہت نمایاں ہے۔ان کے عزیز ترین شاگرد اوران کی تربیت کا ایک نمونہ تھے۔فلسفہ میں اس قدر مہارت تھی کہ بغیر کسی سند کے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں شعبہ فلسفہ کے استاد اور پھر صدر شعبہ مقرر ہوئے۔یہ ندوہ میں علامہ شبلی کے بہت قریب رہے۔اورانہوں نے بھی ان کی تعلیم وتربیت سے خصوصی دلچسپی لی۔اس کی تفصیلات انہوں نے اپنی سرگذشت میں لکھی ہیں۔

روز۔روز کے تماشوں سے تنگ آکر ۱۹۱۳ء میں جب علامہ شبلی ندوہ سے مستعفی ہوکر اعظم گڑھ چلے آئے،اس کے چند دنوں بعد مولانا عبدالباری ندوی اپنے استاد کی خدمت میں

اعظم گڑھ تشریف لائے اور ان کے ساتھ تین دن شبلی منزل میں قیام کیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب دارالمصنّفین کے قائم کرنے کے سلسلے میں مولانا مسعود علی ندوی اعظم گڑھ آ کر اور معائنہ کر کے جا چکے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی ابھی نہیں آئے تھے۔ مولانا عبدالباری ندوی نے اپنے قیام اعظم گڑھ کی تفصیل ان الفاظ میں قلم بند کی ہے:

''حضرت استاذ علامہ اس دوران میں ندوہ سے بالکل علاحدہ ہو کر اپنے وطن اعظم گڑھ جا کر اپنے بنگلہ اور باغ میں عزلت نشین ہو چکے تھے۔ ایک طرف اس بنگلہ اور باغ کو وقف فرما کر دارالمصنّفین کے قیام کی تجویز میں لگے ہوئے تھے، دوسری طرف ہر قسم کی تصنیف و تالیف سے قطع نظر فرما کر صرف سیرۃ النبیؐ میں مشغول تھے۔ احقر کا جی چاہا کہ ایسے عمر بھر کے محسن و محترم استاد کی خدمت میں دو چار دن کے لئے اعظم گڑھ جا کر حاضری دوں۔ اعظم گڑھ پہنچا اور کم از کم تین دن سراپا شفقت استاد ہی کا مہمان رہا اور کم و بیش حضرت کے آرام اور تصنیف کے کام کے علاوہ قریب ہی حاضر رہتا، گفتگو دو ہی چیزوں پر فرماتے، دارالمصنّفین کے قیام اور سیرۃ النبیؐ کی تکمیل۔ ان دو کے سوا تیسری بات مشکل ہی سے فرماتے۔ بس اس طرح مولانا کو اپنے خاتمہ ہی کی فکر معلوم ہوتی تھی، جس کے لئے اب شفیع المذنبین کی سیرت کی تکمیل ہو رہی تھی۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

تین دن رات کی حاضری میں استاد ممدوح کا معاملہ استاد سے زیادہ شفیق کا باپ کا سا رہا۔ باتیں ایسی بے تکلفی اور محبت سے فرماتے جیسے کسی معمولی

طالب علم سے نہیں بلکہ کسی بے تکلف دوست سے ہو رہی ہوں۔''

(سرگذشت ص ۱۸-۱۹)

علامہ شبلی تمام تر غور و فکر کے بعد ندوہ کے لئے کشتیاں جلا کے آئے تھے۔ علی گڑھ کی پروفیسری، بیگم سلطان جہاں بھوپال [۱۸۵۴-۱۹۳۰ء] کی پیش کش اور نہ جانے کیا کیا عزتیں اور منصب ٹھکرا کر آئے تھے۔ نواب محسن الملک [۱۸۳۷-۱۹۰۷ء] نے کہا تھا ''ابھی ندوہ کسمپرسی میں ہے کوئی مزاحم نہ ہوگا، مگر جیسے ہی استحکام آئے گا مولوی آپ پر ٹوٹ پڑیں گے۔'' بقول مولانا سید سلیمان ندوی بالآخر ان کی پیش گوئی پوری ہوئی۔

مولانا عبدالباری ندوی نے یہ تفصیلات سرگذشت میں نہیں لکھی ہیں۔ البتہ ان کی بے وقت موت کا ایک سبب ندوہ سے علاحدگی کو ضرور قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ

''اعظم گڑھ کی آخری زیارت میں یہ بھی محسوس ہوا کہ محترم و مرحوم استاد کو ندوہ سے جدائی کا بہت قلق تھا۔ راقم الحروف کے نزدیک یوں تو اجل مسمی کا وقت آ چکا تھا، لیکن ظاہری اسباب میں ایک سبب کم از کم ندوہ سے علاحدگی بھی رہی ہوگی۔ اس لئے کہ جس وقت میں حاضر ہوا ہوں مولانا فریش بالکل نہ تھے۔ اچھی طرح حسب عادت گفتگو فرماتے اور چلتے پھرتے۔ اصل یہ ہے کہ ندوہ نے ان کے ساتھ عام انسانی حیثیت سے بھی نامناسب سلوک ہی کیا تھا، حالانکہ جس ندوہ کا آج عرب و عجم میں چرچا ہے اور جس کا سب سے بڑا نشان برادر عالی مولانا علی میاں سلمہم ہیں، یہ سو فیصدی عہد شبلی ہی کی دین ہے۔ اس سے پہلے نہ تقریر و تحریر کا کوئی خاص ذوق طلبہ میں تھا اور نہ مضمون نگاری و تصنیف کا، نہ اردو عربی ادب و انشا کا، نہ تاریخ کا۔ یہ سب چیزیں بالکلیہ دور شبلی کی یادگار ہیں۔'' (سرگذشت ص ۱۹)

بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ جب مولانا محمد الحسنی کی کتاب ''سیرت مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوہ'' شائع کی تو مولانا عبدالباری ندوی نے اسے ناپسند کیا اور اس میں علامہ شبلی کو نظر

انداز کئے جانے پر ناراضی ظاہر کی۔ وہ اس کتاب کے مصنف کو بھی عہد شبلی کے ندوہ کی دین خیال کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''آہ! کیسی دولت کھوئی ندوہ نے اپنے ہاتھ سے۔ بہر حال ندوہ جو آج عرب وعجم میں شہرت رکھتا ہے خصوصاً مولانا علی میاں سلمہم اور میرے مخدوم بزرگ اور علی میاں کے برادر بزرگ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم کے صاحبزادے محمد میاں سلمہم جو البعث وغیرہ نکالتے ہیں اس کو یہ عاجز دیانتہً عہد شبلی کی دین جانتا ہے، کیونکہ ان سب کی بنیاد پڑی شبلی ہی کے دور میں تھی۔''
>
> (سرگذشت ص۲۰)

عہد سلیمان

منشی محمد امین زبیری

منشی محمد امین زبیری [۱۸۷۲-۱۹۵۸ء] ریاست بھوپال میں بیگم سلطان جہاں کے لٹریری اسسٹنٹ تھے۔ اس عہدہ پر انہوں نے ۲۴ رسال کام کیا اور متعدد علمی وادبی اور سوانحی کارنامے انجام دئے۔

علامہ شبلی نے سیرت نبوی کی تالیف وتدوین کے لئے اس کے اخراجات کے لئے قوم کے سامنے ایک تجویز رکھی۔ بیگم سلطان جہاں نے سیرت نبوی کے مصارف کی علامہ کی تجویز قبول کرتے ہوئے اس کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے لی اور علامہ شبلی کو ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔ دونوں کے درمیان رابطہ کا ذریعہ مولوی محمد امین زبیری تھے۔ وہ ایک پختہ مشق اہل قلم، ادیب اور سوانح نگار بھی تھے۔ متعدد سوانح عمریاں ان کے قلم سے نکلیں۔ بیگمات بھوپال کا تذکرہ بھی انہی کے قلم سے شائع ہوا ہے۔ سیرت نبوی کی تکمیل سے پہلے ۱۸ ر نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے

وفات پائی اس لئے بیگم سلطان جہاں اس کے لئے بہت فکرمند ہوئیں اور مولوی محمد امین زبیری کو اعظم گڑھ بھیجا۔ بقیہ تفصیل انہی کے قلم سے ملاحظہ ہو:

''۱۸ر نومبر کو شام کو مولانا شبلی کی رحلت کے مراسلۂ برقی نے دل وجگر پر جس طرح یاس وناامیدی کی بجلی گرائی اس کا لفظوں میں کیونکر بیان کیا جائے، بہرحال یہ ایک سانحہ عظیم تھا جو ہوا، تار پڑھنے کے بعد گھنٹوں ایک غم انگیز حالت طاری رہی، دوسرے دن علیا حضرت سرکار عالیہ دام اقبالہا کے ملاحظہ میں وہ تار پیش کیا۔ حضور ممدوحہ کو ایسے جوہر قابل کے انتقال پر نہایت درجہ تاسف ہوا اور فوراً مجھ کو حکم ملا کہ بلاتوقف اعظم گڑھ روانہ ہوجاؤں اور اس امر کا اطمینان کروں کہ مسودات محفوظ ہیں یا نہیں اور آئندہ کیا انتظام ہوگا اور مولانا مرحوم نے اس کے متعلق کیا وصیت کی ہے۔ حضور ممدوحہ نے اسی وقت نہایت جوش کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ''یہ کام ضرور مکمل ہوگا خواہ کیسی ہی کچھ مشکلات کیوں نہ پیش آئیں۔'' چنانچہ میں ۲۰ر نومبر کو روانہ ہوکر ۲۱ر کی صبح کو اعظم گڑھ پہونچا۔ یہ ۲۶ر گھنٹے کا راستہ کیونکر کٹا اور کیا بردانگیز خیالات دل میں پیدا ہوتے رہے نہ ان کو قلم لکھ سکتا ہے اور نہ زبان ادا کرسکتی، اعظم گڑھ سے دو اسٹیشن پہلے اتفاق سے مولوی حمیدالدین صاحب اور مولوی سید سلیمان صاحب سے ملاقات ہوئی ایک نے دوسرے سے تعزیت کی اور دونوں نے مل کر آنسو بہائے۔ معلوم ہوا کہ مولانا نے زندگی سے مایوس ہوتے ہی تمام مسودات کو سربہ مہر کرا دیا تھا اور وصیت کی تھی کہ ''ان ہی دونوں کے سپرد یہ خزانہ بے بہا کیا جائے۔''

انتقال سے چار پانچ دن پہلے یہ دونوں صاحب اعظم گڑھ آ گئے تھے اور بستر مرگ پر مولانا کی آخری التجا ان دونوں سے یہی تھی:

''سب کام چھوڑ دو، سیرۃ، سیرۃ، سیرۃ''

ان دونوں نے اقرار کیا اور مولانا کی روح نے ایک حسرت وامید کے ساتھ فضائے دارفانی میں پرواز کی۔

میں دو دن اعظم گڑھ رہا اور تمام امور کی طرف سے مطمئن ہوکر واپس آیا۔ پہلی جلد بالکل مکمل ہے جو اس رسالہ کے شائع ہوئے نے قبل پریس میں جا چکی ہے۔ باقی چار جلدوں میں

سے دو قریب بہ تکمیل ہیں اور دو کے متعلق بہت کچھ کام کرنا باقی ہے۔ ان پانچ جلدوں کی تقسیم جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے اس طرح کی گئی ہے کہ پہلی جلد میں آن حضرت صلعم کے سادہ حالات زندگی ہیں، دوسرے میں آن حضرت صلعم کے تبلیغی حالات کا تذکرہ ہے اور اس امر کو دکھایا گیا ہے کہ بہ حیثیت ایک پیغمبر کے آپ کی کیا شان تھی، تیسری جلد کلام مجید کے متعلق ہے اور چوتھی جلد میں ان اعتراضات کے جوابات ہیں جو یورپ میں آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہوئے ہیں۔ پانچویں جلد میں مستند اور صحیح معجزات کا بیان ہے۔

اب یہ کام جو کچھ کہ باقی ہے مولانا کے بھائی مولوی حمید الدین صاحب بی اے (جو اس وقت دار العلوم حیدر آباد کے پرنسپل اور ایک فاضل اور عالم گریجویٹ ہیں) اور مولوی سید سلیمان صاحب (جن سے علمی دنیا پوری طرح روشناس ہے) کے ہاتھوں میں ہے اور ان ہی دونوں پر مولانا کا بھروسہ اور ان ہی دونوں کے ساتھ امید وابستہ تھی۔

مولوی حمید الدین صاحب ایک خاموش زندگی بسر کرنے والے بزرگ ہیں۔ انہوں نے مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی مرحوم اور علمائے قدیم سے کتابیں ختم کر کے بی اے کی ڈگری حاصل کی، وہ حافظ ہیں اور نو برس سے قرآن مجید ہی کی خدمت کر رہے ہیں، قرآن مجید کے اشکالات کے متعلق ان کے چھے رسالے عربی زبان میں شائع ہو چکے ہیں۔ جس پر علمائے مصر نے حیرت ظاہر کی اور آج کل وہ حیدر آباد کی اس مشرقی یونیورسٹی کا جو عنقریب وہاں قائم ہونے والی ہے نظام مرتب کر رہے ہیں اور دار العلوم کے پرنسپل کے عہدہ پر ممتاز ہیں، پانچ سو ماہوار تنخواہ ہے اور ایک ہزار تک ترقی، مولوی سید سلیمان مولانا کے شاگرد اور کیسے شاگرد جن پر مولانا نے اپنے چالیس سال کی علمی کمائی صرف کی ہے اور ۱۵/سال کی عمر سے اس وقت تک ان کی تعلیم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، قابل شاگرد میں بھی فاضل استاد کا پورا رنگ قدرت نے بھر دیا ہے اور امید ہے کہ تھوڑے دنوں میں اگر شبلی کا نعم البدل نہیں تو اس کا جانشین ہم کو ضرور مل جائے گا۔ وہ اس وقت پونہ کالج میں فارسی کے پروفیسر ہیں جہاں معقول تنخواہ ملتی ہے۔ اور معقول ترقی کی امید ہے۔

یہ دونوں قابل احترام اصحاب اس بات پر قطعی آمادہ ہیں کہ سب کام چھوڑ کر تکمیل سیرۃ

کریں گے۔ گذشتہ ہفتہ میں مولوی حمید الدین صاحب حیدرآباد جاتے ہوئے دو دن کے لئے ایڈیٹر ظل السلطان کے مہمان ہوئے اور مولانا سید سلیمان صاحب بھی دوسرے دن لکھنؤ سے جہاں وہ نامی پریس میں سیرت کے چھپنے کا انتظام کرنے گئے تھے بھوپال تشریف لائے اور یہ دونوں صاحب دوسرے دن حضور سرکار عالیہ کی بارگاہ میں سلام سے مشرف ہوئے، بہت دیر تک مولانا کے انتقال کا افسوس اور تکمیل سیرۃ کے انتظام کے متعلق تذکرہ ہوا حضور ممدوحہ نے نہایت حوصلہ افزائی فرمائی اور ارشاد کیا کہ ''صرف اسی کام کی تکمیل آپ دونوں کے ذمہ نہیں ہے بلکہ ابھی قوم اور اسلام کے لئے آپ دونوں کو بہت کچھ کرنا ہے۔'' اسی گفتگو کے دوران میں حضور ممدوحہ نے فرمایا کہ ''میں ہر قسم کی امداد دینے کے لئے تیار ہوں، آپ کام کیجئے اور کام کرنے والے آدمی مہیا کیجئے میری تو دلی تمنا ہے کہ میری قوم میں ایسے لوگ پیدا ہوں کہ جو علم و مذہب کی خدمت کریں۔'' غرض یہ دونوں صاحب یہاں سے ایک اور اثر لئے گئے اور ۵/دسمبر کو حضور ممدوحہ نے بدستور امداد جاری رہنے کا فرمان صادر فرمایا۔

اس وقت تک جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے امید ہے کہ باقی جلدوں کی بھی بہت جلد تکمیل ہو جائے گی اور پہلی جلد جو مکمل ہو چکی ہے اس کے لئے اب ملک کی نگاہیں منشی رحمت اللہ صاحب رعدؔ کے مشہور نامی پریس کے دروازہ پر لگی رہیں گی۔

(حوالہ: ماہنامہ ظل السلطان، بھوپال۔ دسمبر ۱۹۱۴ء، صفحہ ۸۵-۸۸)

مولانا شوکت علی

اعظم گڑھ میں جدوجہد آزادی کا سب سے بڑا جلسہ ۲۶/۲۷/نومبر ۱۹۲۱ء کو پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں شرکت کے لئے بی اماں اور ان کے دونوں صاحبزادگان (علی برادران) تشریف لائے اور بڑا شاندار جلسہ ہوا۔ مقامی بااثر لوگوں میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، ٹھاکر سورج ناتھ سنگھ اور سیتارام استھانا وغیرہ شریک

رہے۔(اعظم گڑھ کا سوادھینتا سنگرام، ج اص:۱۹۳)

علی برادران نے حسب معمول اپنی تقریروں سے جلسہ میں جوش بھر دیا اور بی اماں کی موجودگی نے مردتو مرد خواتین میں بھی جذبہ حریت پیدا کر دیا۔

مولانا محمد علی جوہرؔ

علامہ شبلی کے علی گڑھ کے تلامذہ تین قسم کے ہیں۔ایک وہ جو کالج میں ان سے کلاس میں عربی وفارسی پڑھتے تھے۔دوسرے وہ جنہوں نے ان کے درس قرآن میں شرکت کی۔تیسرے وہ جو خارجی اوقات میں علامہ شبلی سے پڑھتے اور امتحانات کی تیاری کرتے تھے۔ان تینوں طرح کے تلامذہ کی خاصی تعداد ہے۔مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸-۱۹۳۱ء] ان کے درس قرآن کے شاگرد تھے۔

مولانا محمد علی جوہرؔ جیسے عبقری مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔وہ اپنے عہد میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آبرو اور اسلام کا وقار تھے، ان کا دل مدۃ العمر اسلام اور عالم اسلام کے لئے دھڑکتا رہا۔تحریک خلافت ان کے دم سے قائم رہی۔تحریک آزادی کے وہ صف اول کے رہنماؤں میں تھے۔ان کی قربانیاں اور جدوجہد کسی سے کم نہیں۔افسوس کہ آزادی کے بعد انہیں فراموش کر دیا گیا۔البتہ جناب محمد اعظم خاں سابق کابینی وزیر حکومت اتر پردیش نے ان کے نام سے رام پور میں یونیورسٹی قائم کر کے ایک قابل ستائش کام کیا ہے۔یونیورسٹی اگر باقی رہی تو ان کے نام اور کام کو زندہ رکھے گی۔

۱۸/نومبر۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے اعظم گڑھ میں وفات پائی۔اس وقت مولانا محمد علی جوہرؔ کو انگریزی حکومت نے گرفتار کر کے لاہور میں قید کیا ہوا تھا۔استاد کی وفات پر وہ کس قدر رنجیدہ تھے اور مزار شبلی پر حاضری کے لئے کس درجہ بےقرار تھے، اس کا اندازہ ان کی ایک تحریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام خط میں لکھی ہے کہ ''جب چھوٹوں گا تو ضرور

روضہ استاد کے پھولوں کی خوشبو سے دماغ وروح کو معطر کروں گا۔'' (مشاہیر کے خطوط،ص ۸۷)

لاہور جیل سے رہائی کے بعد وہ دارالمصنّفین آئے۔اس کی تفصیل مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں۔وہ لکھتے ہیں:

'' یکم مارچ ۱۹۲۱ء کو سالہا سال کے وعدوں کے بعد محترم محمد علی نے شبلی منزل کو رونق بخشی۔جب وہ نظر بند تھے اسی وقت سے یہ وعدہ کر چکے تھے کہ جب وہ نظر بندی سے آزاد ہوں گے تو سب سے پہلے دارالمصنّفین آئیں گے اور چھ مہینے اس گم نام مقام کے کسی گوشہ عافیت میں بیٹھ کر عربی کی تکمیل اور سیرۃ نبویؐ کا انگریزی میں ترجمہ کریں گے لیکن آزادی کے ساتھ جو اطمینان شکن اور امن کش واقعات پیش آئے، وہ سب کے سامنے ہیں۔

بہر حال یہ پرانا وعدہ کسی نہ کسی صورت میں یکم مارچ [۱۹۲۱] کو پورا ہوا۔ہزار ہا آدمی استقبال کے لئے شاہ گنج (۳۲رمیل) سے اعظم گڑھ تک اور شہر اعظم گڑھ کے ناکہ سے شبلی منزل (۲رمیل) تک موجود تھے۔''شبلی منزل'' پہنچ کر سب سے پہلے وہ استاد مرحوم (مولانا شبلی) کی قبر پر گئے اور پھولوں کے وہ تمام ہار جو قدر دانوں نے ان کے گلے میں ڈالے تھے۔قبر کے ایک گوشے میں ڈال دئے۔اس کے بعد انہوں نے دارالمصنّفین کی خانقاہ میں ایک دن ٹھہر کر یہاں کے مختلف شعبوں کو دیکھا اور دوسرے دن شام کو علی گڑھ واپس گئے۔'' (شذرات سلیمانی حصہ اول،ص ۹۱-۹۲)

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ

نامور عالم اور محقق ومصنف، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ بھی دارالمصنّفین اعظم گڑھ تشریف لائے تھے۔اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔البتہ مولانا عمیر الصدیق ندوی نے اپنے ایک تاثراتی

مضمون میں جوانہوں نے ''سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی یاد میں''،نومبر ۱۹۹۰ء میں لکھا ہے،اس میں وہ لکھتے ہیں کہ

''ایک مرتبہ عرب کے ایک ممتاز عالم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ تشریف لائے ، واپس گئے تو اپنے سفرنامہ میں لکھا کہ میں نے بہت سے ملکوں کی سیاحت کی مگر علم کی مملکت دارالمصنّفین میں دیکھی جس کے قلمرو میں اپنا کتب خانہ ، اپنے رفقا، اپنا پریس ،اپنا دفتر ،اپنا گھر ،اپنی مسجد ہے۔مرحوم (صباح الدین صاحب) نے جب یہ تحریر دیکھی تو ان کے چہرہ پر انبساط ونشاط اور فخر وشکر کی سرخی دیدنی تھی۔''(ماہنامہ معارف نومبر ۱۹۹۰ء،ص ۳۶۴-۳۶۵)

پنڈت مدن موہن مالویہ

پنڈت مدن موہن مالویہ [۱۸۶۱-۱۹۴۶ء] بھی شبلی منزل تشریف لائے۔مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ

''گذشتہ ماہ جون [۱۹۲۲ء] میں ہندو یونیورسٹی بنارس کے مشہور بانی اور ہندی زبان کو ہندوستان کی عام زبان بنانے کے پرزور محرک جناب پنڈت مدن موہن مالویہ صاحب نے دارالمصنّفین کو اپنے قدوم سے مشرف فرمایا۔ وہ دیر تک دارالمصنّفین کے کتب خانہ کو، دفتر کو، پریس کو، رفقا کے کمروں کو دیکھتے رہے،اور زبان کے مسئلہ پر بعض ارکان دارالمصنّفین سے گفتگو فرماتے رہے۔ہم کو اس سے خوشی ہوئی کہ موصوف نے اس ادارہ کو رشک کی نظروں سے دیکھا اور پھر بھی پسند کیا۔''

(شذرات سلیمانی،حصہ اول ص:۱۸۴)

پنڈت موتی لال نہرو

پنڈت موتی لال نہرو[۱۸۶۱-۱۹۳۱ء] ہمارے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے والد کو ''شبلی منزل'' سے بے انتہا تعلق تھا۔ وہ جب اعظم گڑھ کے دورہ پر تشریف لاتے تو بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰن:

''دارالمصنّفین ان کا بے تکلف مہمان خانہ ہوتا۔اس زمانہ میں یہاں کا مہمان خانہ ایک کچا بنگلہ تھا،لیکن وہی خام بنگلہ پنڈت جی موصوف کو اتنا پسند تھا کہ فرماتے ''مجھ کو اس کچی عمارت میں جو سکون حاصل ہوتا ہے وہ کہیں اور حاصل نہیں ہوتا۔''

وہ دارالمصنّفین والوں کے ساتھ ہی کھانا تناول کرتے ، ان کو مرغ مسلم بہت پسند تھا،اس لئے جب وہ تشریف لاتے تو دسترخوان پر بیٹھتے تو مرغ مسلم کی پوری پلیٹ اپنی طرف کھینچ لیتے اور فرماتے :''میں بلاشرکت غیرے اس کا مالک ہوں۔''اور پھر پوری پلیٹ ان کے کام و دہن کے لئے وقف ہوجاتی ۔ایک بار مہمان خانہ کے برآمدے میں تشریف فرما تھے تو ایک صاحب آئے جن کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا جو سر پر ایک کوری ہانڈی لئے ہوئے تھا، وہ کیلے کے پتے سے ڈھکی ہوئی تھی، پنڈت جی کو خیال ہوا کہ یہ ان کے لئے کوئی تحفہ ہے،اس لئے بہت ہی بے تکلفانہ انداز میں بولے: ''لاؤ کیا لائے ہو،کھولو۔'' جب ہانڈی کھولی گئی تو انہوں نے دیکھا کہ اس میں سجاؤ دہی ہے۔ یہ دیکھ کر ہنسے اور فرمایا کہ میرے کھانے کی چیز نہیں ہے۔ یہاں مالوی جی بھی آئے ہوئے ہیں،وہ جہاں ٹھہرے ہوئے ہیں وہاں لے جا کر یہ ان کو دو۔ پنڈت جی کے ساتھ مالوی جی بھی اعظم گڑھ آئے ہوئے تھے،ان کو بھی دارالمصنّفین (شبلی منزل) میں ٹھہرنے کی دعوت

دی گئی تھی، لیکن پنڈت موتی لال نہرو نے کہا کہ جس سرزمین کے چپہ چپہ پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی آواز بلند کی گئی ہو وہاں مالوی جی ٹھہرنا پسند نہ کریں گے، پنڈت موتی لال سے مالوی جی کی بڑی بے تکلفی تھی، یہ سن کر انہوں نے پنڈت موتی لال نہرو سے ہنس کر کہا: ''کیا بیہودہ باتیں کرتے ہو۔''

(بزم رفتگاں، حصہ دوم، ص: ۲۹-۳۰)

آپ ان واقعات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ پنڈت موتی لال نہرو کو دار المصنّفین سے کس درجہ گہرا تعلق تھا۔

مولوی عبدالرزاق کان پوری

''البرامکہ'' کے مصنف مولوی عبدالرزاق کان پوری [۱۸۶۲-۱۹۴۸ء] علامہ شبلی کے احباب میں تھے۔ ''البرامکہ'' کی تصنیف میں علامہ نے ان کی بڑی مدد کی تھی۔ اس کا انتساب بھی علامہ ہی کے نام ہے اور بڑے دلچسپ انداز میں ہے:

''بکمال ادب وعقیدت بنابر اظہار شکر یہ تصنیف سلسلہ ہیروز آف اسلام یہ کتاب عالی جناب معلّٰی القاب شمس العلما مولانا مولوی شبلی نعمانی پروفیسر مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڈھ وفیلو یونیورسٹی الہ آباد مدظلہم کے نام نامی واسم گرامی سے منسوب کی جاتی ہے۔

مسند علم از وجودت منبع آداب باد
آستانت قبلہ جان اولی الالباب باد

(یاد ایام، ص: ۲)

وہ بھی اعظم گڑھ آئے اور ایک بار نہیں دوبار آئے۔ مولد شبلی موضع بندول دیکھنے گئے۔ اس سفر کا ذکر انہوں نے صراحت سے نہیں کیا ہے۔ البتہ موضع بندول سے متعلق علامہ شبلی کی

شاعرانہ تعلّی:

فضل بندول گرتو نہ شناسی
آدمی نیستی تو نسناسی

پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ

''حب وطن کے جوش میں انھوں نے کہا ہے کہ ''جو بندول کی عظمت سے انکار کرے وہ انسان نہیں بلکہ نسناس (بن مانس) ہے اور بندول بہشت کا ایک مرغ زار ہے،'' ممکن ہے کہ کسی عہد میں بندول کا یہی درجہ ہو، میں نے اس موقع کی دو دفعہ سیر کی ہے، میری نظر میں وہ ایک معمولی گاؤں ہے۔''

(یاد ایام، ص:۴۶)

کیا مولوی عبدالرزاق کان پوری اس بات سے ناواقف رہے ہوں گے کہ یہ شاعرانہ تعلّیٰ ہے۔؟

مولوی صاحب کے ان دونوں اسفار کی مزید تفصیل دستیاب نہیں ہوئی کہ یہ سفر انہوں نے کس سنہ میں کئے۔ کہاں ٹھہرے اور کن لوگوں سے ملاقاتیں رہیں۔ علامہ شبلی نعمانی سے انتہائی گہرے مراسم کی وجہ سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ عہد شبلی میں اعظم گڑھ آئے ہوں گے۔

مولانا حیدر حسن خاں

نامور عالم دین اور ندوۃ العلما لکھنو کے ممتاز استاد مولانا حیدر حسن خاں دارالمصنّفین کی موتی مسجد کے سنگ بنیاد کی تقریب میں شرکت کے لئے حبیب شبلی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ساتھ تشریف لائے اور اس تقریب میں اول سے آخر تک شریک رہے۔ بڑی اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ مسجد کی بنیاد میں مزدوروں کی طرح کام کیا۔ ان آمد کے متعلق اس کے علاوہ کوئی تفصیل نہیں ملی۔

ملک الشعرا سرور خاں گویاؔ

افغانستان کے ملک الشعرا سرور خاں گویاؔ[۱۸۶۳-۱۹۲۸ء] بڑے قابل شخص تھے۔ ۱۹۳۹ء میں وہ شبلی منزل تشریف لائے اور چند روز قیام کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ

''اس مہینہ ہمارے کابل کے دوست سرور خاں گویاؔ نے اپنی ملاقات کی مسرت بخشی۔ یہ کابل کے مشہور سردار عبدالقدوس خاں کے نواسہ ہیں اور خود بھی ممتاز ادیب اور شاعر ہیں۔ عربی وانگریزی سے واقف اور فارسی ادبیات کے ماہر ہیں۔ انجمن ادبی کابل کے ممبر اور وہاں کی نوجوان ادبی تحریکات کے روح رواں ہیں۔ دو برس ہوئے کہ فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان کے نمائندہ ہو کر یہ اور ہز اکسلنسی صلاح الدین سلجوقی سفیر دہلی ایران گئے تھے اور شاہ پہلوی سے ملے تھے۔ آج کل یہ مکمل تاریخ آل سبکتگین بیہقی کی تصحیح اور اس کے نسخوں کی تلاش میں ہیں۔ اس کا ایک حصہ مدت ہوئی کہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی طرف سے شائع ہو چکا ہے، مگر پوری کتاب اب تک نہیں چھپی ہے بلکہ ملتی بھی نہیں۔ سرور خاں نے اس کا معتد بہ حصہ پیدا کر لیا ہے، مگر ابھی تک اس کے مکمل نسخہ کی تلاش جاری ہے۔

وہ پشاور اور لاہور ہو کر دہلی آئے۔ دہلی سے علی گڑھ گئے اور مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ کی سیر کی۔ یہاں سے حبیب گنج جا کر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے خزانہ کتب کو پڑتالا۔ وہاں سے رامپور جا کر ریاست کے سرکاری کتب خانہ کو دیکھا۔ پھر لکھنؤ پہنچ کر مولوی سید ہاشم صاحب ندوی معتمد دائرۃ المعارف حیدر آباد کے ساتھ دو دن ندوہ میں قیام کیا اور وہاں کے کتب خانہ کو دیکھا بھالا۔ اس کے بعد وہ دارالمصنفین اعظم گڑھ آئے۔ یہاں تین روز ٹھہرے اور یہاں کا کتب خانہ دیکھا۔''

(شذرات سلیمانی، حصہ سوم، ص:۱۹۳-۱۹۴)

اسی سفر میں دارالمصنّفین کے مہمان خانہ میں ایک ادبی تقریب منعقد ہوئی، جس میں مہمان شعرا کے ساتھ مقامی شعرانے بھی شرکت کی۔اس میں علامہ اقبال سہیل اور ادیب شہیر مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی اپنا کلام سنایا۔اسی موقع پر اقبال احمد خاں سہیل کا کلام سن کر سرور خاں گویا نے ازراہ مذاق کہا تھا کہ جب کبھی افغانستان ہندوستان پر حملہ کرے گا میں مال غنیمت میں آپ کو لوٹ کر لے جاؤں گا۔(انتخاب کلام اقبال سہیل، ص:۹)

مولانا موسیٰ جاراللہ

شبلی منزل میں باہر یعنی بیرونی ممالک سے جو علما تشریف لائے ان میں ایک انتہائی اہم نام روسی عالم مولانا جاراللہ [۱۸۷۳-۱۹۴۹ء] کا بھی شامل ہے۔انہوں نے ۱۹۳۹ء میں دارالمصنّفین شبلی منزل کو رونق بخشی تھی۔اور ہفتہ عشرہ قیام کیا۔مولانا سید سلیمان ندوی سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''کچھ دن ہوئے کہ روس کے مشہور مصلح عالم موسیٰ جاراللہ یہاں تشریف لائے تھے۔میں نہ تھا۔میری ان کی ملاقات ۱۹۲۶ء میں مکہ معظّمہ میں ہوئی تھی۔اس کے بعد وہ کئی دفعہ ہندوستان آچکے،مگر ملنے کی نوبت نہیں آئی،اس کا سبب بھی وہی اعظم گڑھ کا سیدھی ریلوے لائن سے دور ہونا ہے مگر بہر حال انہوں نے خود زحمت اٹھائی اور دارالمصنّفین میں تشریف فرما ہوئے۔ہمارے رفقا نے ان کی پذیرائی کی۔اوران کی ملاقات اوران کی چندروزہ صحبت سے فیض اٹھایا۔''
>
> (شذرات سلیمانی، ح۳،ص۱۹۳)

مولانا مفتی کفایت اللہ

مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی[۱۸۷۵-۱۹۵۲ء] اوران کی مشہور زمانہ کتاب ''تعلیم الاسلام'' سے کون ہے جو واقف نہ ہوگا۔ بلاشبہ بڑے عالم وفقیہ اور دہلی مدرسہ امینیہ کے استاد تھے۔ علامہ شبلی کے بارہ میں شاید ان کا بھی دل صاف نہ تھا۔ ''مولانا شبلی کا فتوی خود اپنے الحاد پر'' اس رسالہ کے مرتب مفتی صاحب ہی ہیں، لیکن بعد میں ان کے نقطہ نظر میں اتنی تبدیلی آئی کہ علامہ شبلی کے کفر کے سلسلہ میں دریافت کیا جاتا تو خاموش رہتے۔

جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کے معاصر اوران کے بڑے قریبی دوستوں میں تھے۔ ایک بار شبلی منزل میں یہ بھی آکر ٹھہرے۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی:

> ''دوسرا موقع یہ آیا کہ مفتی صاحب کے صاحبزادوں کی بات میں نے اعظم گڑھ میں ایک خاندان (حکیم محمد اسحاق) میں چھیڑی اور مفتی صاحب مع حافظ احمد سعید صاحب اعظم گڑھ میں دارالمصنّفین آکر میرے مہمان ہوئے اور چند روز قیام فرمایا۔ وہ بات پکی نہیں ہوئی، لیکن اس اثنا میں ہماری دوستی پکی ہوگئی، آخری ہمرہی وہم سفری ۱۹۴۱ء میں دہلی سے بھوپال تک ہوئی جہاں ہم دونوں ریاست کی دعوت پر اس کے نکاح وطلاق کے ضابطوں پر نظر ثانی کرنے کو بلائے گئے تھے اور ساتھ ہی سرکاری مہمان خانہ کے ایک ہی کمرہ میں ٹھہرے تھے۔'' (یادرفتگاں، ص: ۴۴۸)

ڈاکٹر سر ضیاء الدین

ڈاکٹر سر ضیاء الدین[۱۸۷۸-۱۹۴۷ء] ایم اے او کالج علی گڑھ کے طالب علم، استاد اور وائس چانسلر متعدد عہدوں پر فائز اور نیک نام رہے۔ یہ ان طلبہ میں تھے جنہوں نے علامہ شبلی کے عہد میں ایم اے او کالج سے فیضیاب ہوئے تھے۔ یہی سبب ہے کہ دونوں میں گہرے مراسم

تھے۔لندن کی زمانہ طالب علمی میں انہوں نے علامہ شبلی سے خط و کتابت تھی۔مکتوبات شبلی میں ان کا ایک خط شامل ہے۔

فروری ۱۹۳۰ء میں وہ شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کی ایک تقریب میں شرکت کے لئے تشریف لائے تو ان کا قیام شبلی منزل کے مہمان خانہ میں رہا۔دارالمصنّفین کے کتب خانہ کو انہوں نے بالاستیعاب دیکھا۔بالخصوص علم ہیئت سے متعلق کتابیں دیکھیں۔ان میں ایک کتاب ابن یونس حاکمی کی زیچ بھی تھی۔

پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز

پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز[۱۸۷۹-۱۹۵۲ء]استاد الفنسٹن کالج پونہ بڑے صاحب فضل وکمال شخص تھے۔علامہ شبلی کے خاص احباب میں تھے۔مشرقی علوم کے ساتھ جدید مغربی علوم سے بھی واقف تھے۔مدۃ العمر درس وتدریس اور تحقیق وتدقیق میں بسر کی۔عربی وفارسی کے ساتھ سنسکرت اور مرہٹی سے تو واقف ہی تھے عبرانی بھی جانتے تھے۔الفنسٹن کالج پونہ میں پروفیسر رہے۔ان کے متعدد علمی وتحقیقی کارنامے قابل ذکر ہیں۔یہی سبب ہے کہ دارالمصنّفین نے انہیں اپنی مجلس انتظامیہ کا رکن نامزد کیا تھا۔چونکہ دارالمصنّفین سے جو کتاب اس کے متعلقین پر شائع ہوئی ہے اس میں ان کا نام شامل نہیں ہے،اس لئے یہاں ان کا ذکر ضروری خیال کیا گیا۔

بہرکیف وہ رکن ہونے کے باوجود صرف ایک بار پونہ سے دارالمصنّفین شبلی منزل تشریف لائے اور ایک روز قیام کیا۔اوراس کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا۔

سرسیتارام

سرسیتارام[۱۸۸۰-۱۹۵۹ء]نامور مجاہد آزادی اور سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر تھے۔

ان کی شبلی منزل آمد کے بارے میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے لکھا ہے کہ

''ایک بار سر سیتارام بھی دارالمصنّفین میں آ کر مقیم ہوئے۔ وہ مولوی (عبدالسلام ندوی) صاحب کو ان کی شعرالہند کی وجہ سے اچھی طرح جانتے تھے۔ ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ مولوی صاحب بلائے گئے تو ان کو دیکھتے ہی سر سیتارام کرسی سے اٹھ کر ان سے ملنے کو بڑھے تو مولوی صاحب کے غایت احترام کے اظہار میں ان کا پاؤں کرسی سے الجھ گیا اور وہ مشکل سے گرتے گرتے بچے اور جب وہ شعرالہند کی تعریف کرنے لگے تو مولوی صاحب ان کی عظمت کے بار سے دبے جارہے تھے اور یہ عظمت مولوی صاحب کی نظر میں اس لئے تھی کہ انگریزوں نے ان کو سر کا خطاب دیا تھا۔''

(بزم رفتگاں، حصہ اول، ص:۲۵۳)

مرزا جعفر علی خاں آثر لکھنوی

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی[۱۸۸۵-۱۹۶۷ء] اردو کے نامور شاعر و ادیب تھے، کیننگ کالج لکھنو میں تعلیم پائی اور ضلع بلیا کے ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ کلکٹری کے ساتھ شعر و ادب سے ہمیشہ گہرا شغف رکھا۔ ان کے کئی شعری مجموعے اور کتابیں (مطالعہ غالب، تاثرات اثر، فرہنگ اثر، بہاراں، اثرستان، نغمہ جاوید، چھان بین) شائع ہوئیں۔ وہ بھی مسافرین شبلی منزل میں شامل ہیں اور کئی بار تشریف لائے۔ سید صباح الدین صاحب لکھتے ہیں:

''جناب جعفر علی خاں اثر جب بلیا میں کلکٹر تھے تو ایک روز دارالمصنّفین میں تشریف لائے اور مولوی (عبدالسلام ندوی) صاحب سے بڑی گرم جوشی سے ملے اور ان شعرالہند کی تعریف کرتے رہے، لیکن مولوی صاحب کچھ ڈرے سہمے اپنی مونچھوں پر انگلیاں رکھے ہوئے صرف ہوں ہاں کرتے

رہے اور بعد میں انہوں نے کہا کہ میں ان سے باتیں کرنے میں ڈرتا تھا کہ کہیں وہ کسی بات پر کلکٹر کی حیثیت سے مجھ کو قانون کی گرفت میں نہ لے لیں۔'' (بزم رفتگاں حصہ اول، ص:۲۵۲)

مولانا احمد سعید دہلوی

مولانا احمد سعید دہلوی [۱۸۸۸-۱۹۵۹ء] سابق صدر جمعیۃ علمائے ہند نے جامع مسجد مبارک پور میں ایک تقریر کی تو ان پر انگریزی حکومت نے مقدمہ قائم کرادیا۔ چنانچہ یہ مقدمہ ان پر اعظم گڑھ کی عدالت میں چلا اور انہیں سزا ہوئی۔ اور یہ سزا انہیں اعظم گڑھ جیل میں کاٹنی پڑی۔ اس سلسلہ میں انہیں پہلے مقدمہ پھر سزا کے لئے اعظم گڑھ رہنا پڑا تھا۔ مقدمہ کے زمانہ میں ۱۹۴۰ء میں ان کا متعدد بار قیام شبلی منزل میں رہا۔ اسی زمانہ میں مولانا سید سلیمان ندوی سے ان کے گہرے روابط قائم ہوئے۔ (متاع رفتگاں ص ۱۰۵)

امجد حیدرآبادی

امجد حیدرآبادی [۱۸۸۸-۱۹۶۱ء] کو حکیم الشعرا کہا جاتا ہے۔ یہ لقب انہیں مولانا سید سلیمان ندوی نے دیا تھا۔ وہ اپنے رنگ کے یگانہ تھے۔ علامہ شبلی کے احباب میں تھے۔ ان کا کلام معارف میں شائع ہوتا تھا۔ مجموعہ کلام عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔ دارالمصنّفین سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے۔ ایک بار وہ دارالمصنّفین بھی آئے۔ اور بقول مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ''ان کی سادہ مگر پرتاثیر شخصیت اب تک نگاہ میں ہے۔''

(متاع رفتگاں، ص:۱۱۳)

مہاتما گاندھی

شبلی منزل مجاہدین آزادی کا ایک اہم مرکز تھا۔جدوجہد آزادی کے زمانہ میں شاید ہی کوئی ایسا مرد مجاہد آزادی ہو جو یہاں نہ آیا ہو۔مہاتما گاندھی[۱۸۸۹-۱۹۴۸ء] بھی یہاں تشریف لائے۔دارالمصنّفین کے سابق ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ

> ''مختلف اوقات میں یہاں ہندو اور مسلمان لیڈر برابر آتے رہتے۔گاندھی جی جب اپنے دورہ میں اعظم گڑھ آئے تو ان کے قیام کا انتظام تو اور جگہ تھا،مگر وہ خود شبلی منزل آئے اور ایسے وقت آئے کہ اہل دارالمصنّفین ایک کھلی جگہ پر مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے۔یہ دیکھ کر گاندھی جی نہایت ادب اور خاموشی سے کنارے بیٹھ گئے اور ساتھ آنے والوں کو باادب اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔انہوں نے دارالمصنّفین کے کتب خانہ کو لالٹین کی روشنی میں دیکھا اور جب دارالمصنّفین کے ایک رفیق نے ان کے سامنے دستخط کے لئے اپنی یادداشت کی کتاب پیش کی تو انہوں نے اپنا دستخط اردو میں کیا۔''
>
> (بزم رفتگاں حصہ دوم،ص:۲۹)

پنڈت جواہر لال نہرو

ہندوستان کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو[۱۸۸۹-۱۹۶۴ء] کا شبلی منزل اور وابستگان ''شبلی منزل'' سے بڑا گہرا تعلق تھا۔جدوجہد آزادی کے سلسلہ میں انہوں نے بارہا اعظم گڑھ کا دورہ کیا اور ہمیشہ ان کا قیام شبلی منزل ہی میں رہا۔وزیراعظم بننے کے بعد وہ اعظم گڑھ نہیں آئے اور آزادی سے پہلے ایک بار کے سوا کسی اور مقام پر ٹھہرنے کا ذکر نہیں ملتا ہے۔
چونکہ وہ ہر بار شبلی منزل ہی میں ٹھہرے۔اور کئی کئی روز ٹھہرے۔نہ صرف قیام کیا بلکہ

شبلی منزل کے رفقا و وابستگان کے ساتھ باتیں کیں، گھومے ٹہلے، کھانا کھایا۔ اس لئے شبلی منزل سے متعلق ان کے متعدد واقعات مشہور ہیں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ

''پنڈت موتی لال نہرو نے دارالمصنّفین سے جو ربط اور لگاؤ پیدا کیا اس کو ان کے فرزند ارجمند پنڈت جواہرلال نہرو نے اور بھی زیادہ استوار اور مستحکم کر دیا۔ وہ جب کبھی اعظم گڑھ آتے تو دارالمصنّفین ہی میں قیام کرتے، جن لوگوں نے ان کو یہاں ٹھہرتے ہوئے دیکھا ہے وہ اس کے متعلق بڑی لذیذ حکایتیں بیان کرتے ہیں۔ آزاد ہندوستان کا ہونے والا یہ پہلا وزیراعظم یہاں آتا تو بڑی سادگی سے رہتا۔ وہ اپنی دھوتی خود اپنے ہاتھوں سے دھوتے۔ یہاں کے لوگوں سے بچوں کی طرح بڑے اخلاص اور محبت سے ملتے، لوگ تعجب کرتے کہ انگریزوں کی جابرانہ حکومت کے علی الرغم یہ دارالمصنّفین والے ایک باغی لیڈر کو اپنے یہاں کیسے ٹھہراتے ہیں۔ وہ جب دارالمصنّفین میں ہوتے تو سی، آئی، ڈی والے اس کی چہار دیواری کے چاروں طرف متعین ہوجاتے، مگر یہاں کے لوگوں کو پنڈت جواہرلال نہرو سے ایسی والہانہ محبت تھی کہ اس زمانہ میں انہوں نے ان کے ساتھ بیٹھ کر تصویر بھی کھینچوائی، جو اب تک محفوظ ہے، اس میں پنڈت جی ایک بہت ہی خوش رو، خوش اندام اور رعنا جوان نظر آتے ہیں۔''

(بزم رفتگاں حصہ دوم، ص۳۳-۳۴)

پنڈت جواہرلال نہرو کے اعظم گڑھ دورے اور شبلی منزل میں قیام کی مصروفیات کے بارے میں صباح الدین صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ

''وہ اعظم گڑھ آتے تو یہاں ان کے اور بہت سے مشاغل ہوتے، شہر میں کانگریس کے چندے کے لئے بھی مولانا مسعود علی صاحب کے ساتھ نکلتے اور لوگوں سے چندہ مانگتے۔ ایک مرتبہ یہ دونوں صاحب چندہ مانگتے ہوئے

ایک دولت مند بزاز کی دوکان میں داخل ہوئے، وہ ان لوگوں کو دیکھ کر بہت گھبرایا کہ حکومت کے یہ باغی لیڈر کیسے اس کی دوکان میں داخل ہو گئے، جب اس سے چندہ مانگا گیا تو بڑی مشکل سے ایک روپیہ نکال کر دیا جس سے یہ لوگ بہت مکدر ہو کر اس کی دوکان سے نیچے اترے۔ وہیں ایک سبزی فروش سبزی بیچ رہا تھا، مولانا مسعود علی ندوی نے اس سے کہا کہ بھائی تم بھی کچھ دے دو، وہ سبزی فروش فرط تعظیم سے کھڑا ہو گیا اور اپنی تھیلی کھول کر کہا کہ ''سرکار! یہ دن بھر کی بکری ہے قبول کر لی جائے۔'' اور یہ کہہ کر ساری رقم چندے میں دیدی۔ پنڈت جواہر لال بہت متاثر ہوئے اور بولے کہ ہم کو عوام ہی کے ایثار اور اخلاص پر تمام تر بھروسہ ہے اور ہم کو ہندوستان کی اس جنگ آزادی میں ان ہی کی مدد اور جذبہ ایثار سے فتح حاصل ہوگی۔'' (ایضاً)

پنڈت جواہر لال نہرو بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ان میں احسان شناسی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ایک بار پنڈت جی اپنے حبیب خاص مولانا مسعود علی ندوی [۱۸۸۹-۱۹۶۷ء] مہتمم دارالمصنّفین کے ساتھ اعظم گڑھ کے دورہ میں ضلع اعظم گڑھ کی سرحد پار کر کے غازیپور میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ اب غازی پور بھی ہو لیا جائے۔ وہاں کوئی پروگرام تھا، قریب کے ریلوے اسٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا کہ گاڑی روانہ ہو چکی ہے۔ اتفاق سے اسی وقت ایک ٹرالی اسٹیشن کی طرف آتی ہوئی دکھائی پڑی، جس پر ایک اورسیر (Overseer) اور چند قلی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہی اورسیر صاحب سابق ایم ایل اے امجد علی غزنوی مرحوم کے والد تھے۔ مولانا مسعود علی ندوی نے ان سے اپنے سفر اور ٹرین چھوٹ جانے کے بارے میں بتایا تو انہوں نے اپنی ٹرالی میں دونوں کو بیٹھا کر قریب کے اسٹیشن پر پہنچا دیا جہاں سے غازی پور جانے کے لئے انہیں ٹرین مل گئی۔ انگریز حکام بالا کو جب اورسیر صاحب کی پنڈت جی کے ساتھ اس ہمدردی کی اطلاع ملی تو وہ معطل کر دئے گئے۔ پنڈت جی کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہیں بہت افسوس ہوا۔ چنانچہ آزادی کے بعد انہوں نے اورسیر صاحب کو یاد رکھا۔ اورسیر صاحب کے صاحبزادے

امجد علی غزنوی مرحوم کی سیاست دراصل پنڈت جی کے اسی احسان شناسی کے جذبے سے شروع ہوئی اورانہیں بڑااثر ورسوخ حاصل ہوا۔ یہ سب ان کے والد کے اسی کارنامے کا نتیجہ تھا۔

شبلی منزل محض پنڈت جواہرلال نہرو کے ٹھہرنے کی جانہیں تھی وہ اس کے علمی کاموں سے بھی دلچسپی لیتے تھے۔مولانا مسعودعلی ندوی کی خواہش پروہ دارالمصنّفین کے لائف ممبر بھی بنے اورایک ہزارروپئے ادا کئے۔ یہ رقم انہوں نے کئی قسطوں میں ادا کی تھی۔خیال کیجئے کہ وزیراعظم نے ایک ہزار کی رقم کئی قسطوں میں ادا کی ۔کیا آج کوئی اس کا تصور کرسکتا ہے۔پنڈت جی پر چاہے جوالزامات لگائے جائیں وہ تھے تو بے مثل اور بےنظیر شخصیت کے مالک۔

مولانا سیدسلیمان ندوی عرب وہند کے تعلقات پرلکچر دینے کے لئے آلہ باد گئے تو ایک خطبہ میں پنڈت جی بھی شریک ہوئے ،ان کے خطبہ سے متاثر ہوکرفرمایا کہ ایسے لکچر کسی قوم کے لئے بھی باعث فخر ہوسکتے ہیں۔(بزم رفتگاں حصہ دوم،ص:۳۵)

ان کے ۱۹۳۷ء کے انتخابی دورہ کے سلسلہ میں صباح الدین صاحب نے لکھا ہے کہ

> ’’انتخابی کے سلسلہ میں ۱۹۳۷ء میں اعظم گڑھ آئے توان کے کھانے کاانتظام شبلی منزل ہی میں تھا،اس موقع پرکانگریس کے ایک مقامی رکن نے کہا کہ پنڈت جی نے اپنی بیوی کی موت کے بعد سے گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے،اس لئے ان کے کھانے میں گوشت کے بجائے صرف سبزی ہی ہو۔ چنانچہ کئی قسم کی ترکاریاں اورسبزیاں دسترخوان پررکھی گئیں،وہ دوپہر کودورہ سے ایسی خراب موٹر سے آئے کہ سرسے پاؤں تک بالکل گردآلود ہوگئے تھے،فوراً ہی غسل خانہ گئے ،اپنے بیگ سے لسٹرین کی شیشی نکالی اورفرمایا کہ میں ہمیشہ اس کواپنے ساتھ رکھتا ہوں،اس کے چندقطرے پانی میں ڈال کر غرارہ کیا، ناک صاف کی اورمنہ ہاتھ دھوکر دسترخوان پرآئے توان سے کہا گیا کہ آپ نے تواب گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے،اس لئے آپ کے لئے اب کی مرتبہ گوشت کی مختلف قسمیں تیارنہ کی جاسکیں،آپ کے لئے ترکاریاں

ہیں اور بقیہ شرکائے دسترخوان کے لئے گوشت ہے۔ یہ سن کر پنڈت جی نے فرمایا کہ کم بختوں نے یہ مشہور کر کے کہ میں نے گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے، مجھ کو ہر جگہ بھوکا رکھا ہے۔ کئی وقت کے بعد میں آج جی بھر کے کھانا کھاؤں گا، یہ کہہ کر گوشت کی پلیٹ اپنی طرف کھینچ لی اور خوب سیر ہو کر کھایا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا، لیکن اس وقفہ میں شبلی منزل میں درشن کرنے والوں کا ہجوم ہو گیا، شور وغل سن کر پنڈت کی باہر نکل آئے اور ایک خاص ادا کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

جب یہاں سے رخصت ہونے لگے تو ایسی موٹر پر بیٹھے کہ اندر سے صاف دکھائی نہیں دیتے تھے، مگر درشن کرنے والے تھے کہ ٹوٹے پڑ رہے تھے، یہ صورت دیکھ کر پنڈت جی غصہ میں موٹر سے باہر نکل گئے اور اس کے مڈگارڈ پر بیٹھ گئے، بولے کہ لو خوب درشن کر لو اور ڈرائیور سے کہا کہ موٹر چلاؤ، اسی مڈگارڈ پر بیٹھے اور گرد کھاتے ہوئے دور تک چلے گئے۔''

(بزم رفتگاں حصہ دوم، ص: ۳۵-۳۶)

وہ شبلی منزل آتے تو جی بھر کے باتیں کرتے۔ دراصل انہیں شبلی منزل کے در و دیوار سے اپنائیت ہو گئی تھی۔ قلعہ احمد نگر جیل سے رہائی کے بعد ۱۹۴۵ء میں اعظم گڑھ آئے تو سہ پہر کی چائے کا انتظام شبلی منزل میں تھا، مگر وہ دیر سے ۸/ بجے شب میں پہنچے۔ چنانچہ اس وقت چائے پی کر اپنی وضع داری قائم رکھی اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کھانے کا نظم کہیں اور تھا، جب انہیں یاد دلایا گیا تو کہا ٹھہرو جی، بہت دنوں کے بعد آیا ہوں مجھے اطمینان سے گفتگو کرنے دو۔''

(بزم رفتگاں حصہ دو، ص: ۳۶)

پنڈت جی کے اس سفر شبلی منزل کا ذکر جناب احمد سعید ملیح آبادی [۱۹۳۹-۲۰۲۲ء] نے بھی اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک دن معلوم ہوا کہ جواہر لال نہرو اعظم گڑھ آ رہے ہیں اور جلسہ عام

میں تقریر کریں گے۔ بڑے میدان میں جلسہ ہوا جو رات دس بجے ختم ہوا۔ جواہر لال نہرو اور مولانا مسعود علی میں گہری دوستی تھی۔ پنڈت نہرو جب بھی اعظم گڑھ آتے تو قیام وطعام شبلی منزل میں ہوتا لیکن اس مرتبہ یہ ممکن نہیں ہوسکا اور پنڈت نہرو کو رات الگو رائے شاستری کے گھر گذارنی پڑی۔ وہ شہر کے کانگریس کے لیڈر تھے۔ جلسہ ختم کر کے پنڈت نہرو پبلک سے بچتے بچاتے باغوں باغوں ہو کر رات گیارہ بجے کے قریب شبلی منزل پہنچے۔ لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے گھپ اندھیرا تھا۔ لالٹین اور ٹارچیں لئے ہم لوگ پنڈت نہرو کے استقبال کے لئے لان میں کھڑے تھے۔ مولانا مسعود علی اور پنڈت نہرو نے جیسے ہی ایک دوسرے کو دیکھا تو نہرو دوڑ کر اور جست لگا کر یہ کہتے ہوئے ''ارے میرے مسعود علی'' ان کی گردن میں جھول گئے۔ مسعود علی صاحب دراز قد اور تن وتوش والے تھے۔ نہرو پستہ قد اور چھریرے بدن کے تھے۔ یہ ایک انتہائی جذباتی اور دلچسپ منظر تھا۔ کچھ دیر بعد دونوں الگ ہوئے تو مسعود علی صاحب نے پنڈت نہرو سے کہا ''اب مجھے اپنے چہرے پر ٹارچ ڈالنے دو، دیکھیں برسوں جیل میں رہنے کے بعد بھی تم پر بڑھاپا آیا کہ نہیں۔'' نہرو تن کے کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ''لو جی بھر کے دیکھ لو'' ٹارچ کی روشنی ڈالنے کے بعد مسعود علی صاحب نے کہا کہ ''تم کبھی بوڑھے نہیں ہو گے۔'' دونوں ایک دوسرے کو تم سے مخاطب کر رہے تھے، بے تکلفی کی حد تک دوستی تھی۔ پھر نہرو نے کہا ''میں نے اردو تم سے پڑھی تھی اور اردو میں پہلا خط تمہیں لکھا تھا۔

اس گفتگو کے بعد وہاں کھڑے لوگوں سے پنڈت نہرو کا تعارف کرایا گیا۔ جب میری باری آئی تو مولانا مسعود علی نے کہا کہ پنڈت جی ہم اور تم ایک نمبر کے نیشنلسٹ ہیں۔ اب میں تم سے ایک صحیح ایک بٹہ دو نیشنلسٹ باپ

کے بیٹے سے ملواتا ہوں، نہرو بہت متاثر ہوئے، ہاتھ ملانے کے ساتھ ملکے سے بغل گیر ہوئے، میرے لئے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ وہ میرے ہیرو تھے، میں پھولا نہیں سما رہا تھا۔ ان دنوں آزادی کے متوالے نوجوانوں کے ہیرو نہرو تھے۔ ان کی نقل میں ویسی ہی سفید گاندھی کیپ، نہرو کٹ صدری میرا لباس تھا۔ نہرو پشاوری سینڈل پہنتے تھے۔ میرے پاؤں میں بھی ویسے ہی سینڈل تھے۔ نہرو کے محبت بھرے برتاؤ سے میرا دل بڑا ہوگیا، میں نے کہا کہ ''آپ بہت جلد ہندوستان کے وزیراعظم بننے والے ہیں۔'' نہرو کی عادت تھی کہ کسی بات پر بھڑک اٹھتے، میری بات سن کر بولے ''تمہیں کیسے معلوم کہ میں وزیراعظم بنوں گا۔'' میں نے کہا میرا دل کہتا ہے آپ سے بڑھ کر کون ہے۔ وزیراعظم تو آپ کو بننا ہے۔ ایک وعدہ کیجئے کہ جب ہندوستان آزاد ہوگا اور آپ وزیراعظم بنیں گے تو اعلیٰ تعلیم کے لئے مجھے امریکہ بھیجیں گے۔'' پنڈت جی نے قہقہہ لگایا اور مولانا مسعود علی سے کہنے لگے ''دیکھا، لڑکا کیسا چالاک ہے، مجھے ابھی سے پابند کرنا چاہتا ہے۔''

اس گفتگو کے بعد پنڈت نہرو نے شیروانی کی جیب سے قلم نکال کر دکھایا اور کہا کہ قلعہ احمد نگر میں اپنی کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' اسی قلم سے لکھی ہے۔ یہ پارکر ففٹی ون قلم تھا، بڑی شہرت تھی کہ امریکہ میں اس نام کا قلم بنا ہے۔ پنڈت جی کے ہاتھ سے قلم لے کر میں نے اسے للچائی نظروں سے دیکھا اور واپس کر دیا۔ مولانا مسعود علی نے کہا، پنڈت جی! آؤ اور چائے پیو۔ مہمان خانے میں فرشی انتظام تھا۔ ناشتے چائے کا بہت اہتمام کیا گیا تھا۔ نہرو کے داماد فیروز گاندھی بھی موجود تھے۔ مجھے بھی جگہ ملی۔ یہ بیٹھک آدھی رات تک چلی۔ پھر پنڈت نہرو اور ان کے ساتھی رخصت ہوئے۔ چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ الگو رائے شاستری کے نام الہ آباد سے نہرو کا

غصہ سے بھرا ہوا خط آیا کہ ''تم نے مجھے شبلی منزل میں رات بسر نہیں کرنے دی اس سے میرے چالیس برس کے تعلقات مجروح ہوئے۔'' پنڈت نہرو جب بھی اعظم گڑھ آتے تو قیام شبلی منزل میں ہوتا، ان کے لئے کھانے میں پلاؤ، مرغ مسلم اور کباب خاص طور سے ہوتے۔ اس رات نہرو کو کھانا بھی نصیب نہیں ہوا۔ مسلم لیگ کی سیاست سے ماحول جیسا بن رہا تھا اس میں شہر کے کانگریسی لیڈروں نے سیکورٹی کے خیال سے ضروری سمجھا کہ پنڈت نہرو دوسری جگہ رات بسر کریں۔ اس بات بہت دن چرچا رہا۔ مولانا مسعود علی کے نام بھی نہرو کا خط آیا اور اپنے رنج کا اظہار کیا۔''

(میری صحافتی زندگی، ص: ۲۰-۲۲)

جگر مرادآبادی

جگر مرادآبادی[۱۸۹۰-۱۹۶۰ء] کا ''شبلی منزل'' اور اعظم گڑھ سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے اس کی تفصیل اس طرح لکھی ہے:

''اعظم گڑھ اور دارالمصنّفین سے ان کا تعلق بہت قدیم تھا۔ ان کا تعارف یہیں سے ہوا اور ان کی شہرت نے یہیں سے پر پرواز نکالے۔ آج سے پینتیس چالیس سال پہلے جب وہ چشمہ کے تاجر کی حیثیت سے اعظم گڑھ آتے تھے، اس وقت مرزا احسان احمد صاحب نے ۱۹۱۹ء میں مخزن (لاہور) میں پہلی مرتبہ ان کا تعارف کرایا، پھر ۱۹۲۱ء میں ان کا پہلا دیوان ''داغ جگر'' اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ یہ مجموعہ معارف پریس میں چھپا تھا۔ اسی زمانہ میں ان کی غزلیں معارف میں شائع ہونے لگیں۔ ان کے دوسرے دیوان شعلہ طور پر حضرت سید صاحب نے تعارف لکھا اور معارف میں اس

پر مفصل تبصرہ لکھا گیا۔ جگر نے ان تعلقات کا پورا خیال رکھا۔ اپنی شہرت کے شباب کے زمانہ میں جب اعظم گڑھ آتے تو مرزا احسان احمد صاحب ہی کے یہاں ٹھہرتے اور دارالمصنّفین ضرور آتے اور اکثر بغیر فرمائش کے بھی اپنا کلام سناتے اور کہتے یہاں سنانے میں جی لگتا ہے۔''

(متاع رفتگاں، ص:۱۰۸)

جگر کے قیام اعظم گڑھ اور یہاں کے ادبا وشعرا سے رسم وراہ اور بے تکلفی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں مگر وہ قابل ذکر نہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

مجلس احرار کے قائد، نامور مجاہد آزادی اور مشہور عالم دین مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی [۱۸۹۲-۱۹۵۶ء] بقول مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ''دارالمصنّفین کے لوگوں سے بڑا اخلاص رکھتے تھے۔ جب مشرقی اضلاع کی جانب آنا ہوتا تو دارالمصنّفین ضرور آتے۔''

(متاع رفتگاں، ص:۴۷)

مولانا مرحوم کس درجہ بلند رتبہ شخص تھے اس کا اندازہ وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کی اس تحریر سے لگایا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے میں بہت برسوں سے واقف ہوں۔ جدوجہد آزادی کے دوران ہم ایک دوسرے کے بہت قریب رہے اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مولانا موصوف جس عقیدہ میں یقین رکھتے تھے اور جس جرات اور آہنی استقامت کے ساتھ وہ اس پر قائم رہے اس کے سبب میں ہمیشہ ان کا مداح رہا اور ان کا احترام کرتا رہا۔ آزادی سے قبل اور اس کے بعد بھی انہوں نے بہت سی تکالیف اٹھائیں

حتیٰ کہ آزادی کے فوراً بعد ہی پاکستان اور شمالی ہند میں جو المیہ رونما ہوا اور
جس کی لپیٹ میں وہ شدید طور پر آئے۔مگر اس سے ان میں تلخی نہیں آئی اور
انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔وہ اپنے شہر لدھیانہ میں ہندو مسلمان اور سکھ
سب کے ہی محترم رہے۔‘‘(ہندوستان کی جنگ آزادی،ص:۲)

مولانا لدھیانوی کے وہ کارنامے جو انہوں نے لدھیانہ اور قرب وجوار میں تقسیم کے فسادات میں رونما ہوئے اور انہوں نے جس طرح جدوجہد کی وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ڈاکٹر ذاکر حسین

سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین [۱۸۹۷-۱۹۶۹ء] نے بھی شبلی منزل کو رونق بخشی۔دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی سے ان کے دیرینہ تعلقات بلکہ والہانہ لگاؤ تھا۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ابتدائی دور میں کئی مرتبہ اس کے تعاون کے لئے وہ اعظم گڑھ آئے اور شبلی منزل میں ٹھہرے۔وہ علامہ شبلی کے ایک شاگرد اقبال احمد خاں سہیل کے ہم درس اور بے تکلف دوست تھے۔انہی گوناگوں مراسم اور ہندوستان کی حکومت میں ایک بڑے عہدہ پر فائز ہونے کے سبب دارالمصنّفین کی گولڈن جبلی کی صدارت کے لئے انہیں مدعو کیا گیا اور انہوں نے صدارت قبول کی۔اس موقع پر انہوں نے بڑا شاندار عالمانہ خطبہ دیا جو شائع ہو چکا ہے۔اس سے بھی دارالمصنّفین،اس کے رفقا واہل قلم سے ان کی گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔وہ فرماتے ہیں:

’’آج مجھے فخر ہے اس پر کہ پچھلی نصف صدی میں ہمارے ملک میں
سیاست کی تند وتیز آندھیوں کے درمیان تحقیق وتخلیق کے چراغ جلتے رہے
اور علم وادب کی جوت جگاتے رہے۔اور مسرت ہے اس کی ہے کہ ان میں
سے ایک سراج منیر دارالمصنّفین اعظم گڑھ ہے جس کے ساتھ مجھے کئی

رشتوں سے وابستہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔اس لئے کہ یہ یادگار ہے میرے محترم بزرگ مولانا شبلی نعمانی اوران کے شاگردان مولانا سید سلیمان ندوی اورمولانا عبدالسلام ندوی مرحومین کی اور کارنامہ ہے میرے محترم اور شفیق بھائی مولوی مسعودعلی صاحب ندوی اورعزیز دوست شاہ معین الدین اورمولوی صباح الدین عبدالرحمٰن اوران کے رفقائے کارکا۔اوراس لئے کہ اس سے جامعہ ملیہ اسلامیہ جس کی خدمت میں میں نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ گزارا ہے، ہم خیالی اور ہم مشربی کا تعلق رہا ہے۔ان ذاتی تعلقات سے قطع نظر ایک مسلمان اور ہندوستانی کی حیثیت سے مجھے یہ ادارہ جوقوم کی بیش بہا دولت ہے، دل سے عزیز ہے۔اوراس کے جشن میں شرکت کر کے سچی خوشی محسوس ہوتی ہے۔

آج اس مبارک موقع پر جب دارالمصنّفین اعظم گڑھ اپنی زندگی کی پہلی نصف صدی پوری کر کے نصف دوم میں قدم رکھ رہا ہے ،سب علم دوست اورمحبّ وطن ہندوستانیوں،خصوصاً مسلمانوں کا فرض ہےاور ہم آپ جوملک کے مختلف حصوں میں آ کر یہاں جمع ہوئے ہیں اسے ساری قوم کی طرف سے فرض کفایہ کے طور پر ادا کر رہے ہیں کہ دارالمصنّفین اوراس کے موسس روحانی مولانا شبلی نعمانی کی گراں قدر علمی وادبی خدمات کا،جس سے انہوں نے بلاواسطہ ہندوستان کے اور بالواسطہ ساری دنیا کے تہذیبی سرمائے میں قابل قدر اضافہ کیااوران کی ان ملی خدمات کا جن سے انہوں نے حب وطن، آزادی اورقومی یک جہتی کی تحریکوں کوسہارا دیا،کم سے کم ایک سرسری جائزہ لیں ،ان کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کریں اور یہ سوچیں کہ اس چشمہ فیض کو جاری رکھنے اوراس کے دامن کووسیع کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

علامہ شبلی نعمانی اور دارالمصنّفین کا علمی اور ادبی عطیہ زیادہ تر اسلامی تاریخ وسیر، تاریخ ہند اور تاریخ وتنقید ادب کے میدانوں سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی خصوصیات میں نفس مضمون کی معروضیت، لہجے کے اعتدال، زبان و بیان کی سلاست کے علاوہ اوران سے بھی زیادہ نمایاں قلب ونظر کی وسعت ہے۔ اس مکتب فکر کے مصنفوں نے جہاں کہیں اسلامی تہذیب کے تعلقات قدیم یونانی، ایرانی، ہندی تہذیب سے دکھائے ہیں وہاں فصل کے بجائے وصل کے پہلو کو ابھارا ہے اور قصہ سکندر رو دارا سنانے پر' حکایت مہر وفا' بیان کرنے کو ترجیح دی ہے۔''(افکار ذاکر، ص ۷۵-۷۶)

سروش طباطبائی

سروش طباطبائی، جعفر علی خاں آثر لکھنوی کے بھانجے تھے۔ ان کا مذاق شعر وادب بڑا پختہ تھا۔ لکھنوی طرز میں شعر کہتے تھے۔ ان کی شبلی منزل آمد کا قصہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''جناب جعفر علی خاں آثر کے بھانجے سروش طباطبائی بھی اپنی سرکاری ملازمت کے دورہ میں ایک بار اعظم گڑھ آئے تو صرف مولوی (عبدالسلام ندوی) صاحب کی ملاقات کی خاطر دارالمصنّفین بھی آئے۔ وہ بھی اچھا علمی وادبی ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ ''حضرت! میں نے آپ کی شعرالہند سے بہت کچھ سیکھا ہے۔'' اور پھر اس کی بہت سی خوبیاں بیان کرتے ہوئے بولے ''یہ اردو کی ان چند کتابوں میں ہے جن سے ملک کا ادبی مذاق بنا ہے۔'' اور جب وہ دل کھول کر اس کی تعریف کررہے تھے تو مولوی صاحب نے یکا یک بات کاٹتے ہوئے اور اپنی

مونچھوں کو اینٹھتے ہوئے ان سے پوچھا کہ آپ کی تنخواہ کیا ہے۔! اور طباطبائی کی علمی وادبی گفتگو وہیں کی وہیں رہ گئی۔''

(بزم رفتگاں، حصہ اول، ص۲۵۲)

سر تیج بہادر سپرو

نامور وکیل اور ماہر قانون سر تیج بہادر سپرو ہندو مسلم اتحاد کے شاید سب سے بڑے علمبردار تھے۔ وہ اردو زبان کے بھی بڑے بہی خواہ اور ہمدرد تھے۔ عرصہ تک انجمن ترقی اردو کے مربی و سرپرست رہے۔ یہی نہیں اردو کی خدمت کے لئے انہوں نے الہ آباد میں روح ادب کے نام سے ایک مجلس بھی قائم کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ '' اردو زبان ہندو مسلمانوں کا مشترک اور ناقابل تقسیم ترکہ ہے۔''

ان کی شبلی منزل آمد کے بارے میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے کہ

''کئی سال ہوئے کسی مقدمہ کے سلسلہ میں اعظم گڑھ ان کا آنا ہوا تو دارالمصنّفین دیکھنے کے لئے بھی آئے۔ کتب خانہ میں فارسی کی الماری میں کلیات صہبائی دیکھ کر کہا کہ میرے دادا مولانا صہبائی کے شاگرد تھے اور کلیات نکال کر دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ ہندوستان میں آئندہ ان سے بھی بڑے وکیل، قانون داں اور مدبر پیدا ہوں گے لیکن ہندو مسلم اتحاد اور دونوں کی مشترک تہذیب کا ایسا نمونہ شاید اب نہ پیدا ہو سکے۔''

(متاع رفتگاں، ص:۲۱)

یہ فروری ۱۹۳۰ء کا قصہ ہے۔ اسی ماہ میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین بھی شبلی منزل اور شبلی کالج میں تشریف لائے تھے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

عالمی شہرت یافتہ عالم و محقق و مصنّف ڈاکٹر محمد حمید اللہ [۱۹۰۸-۲۰۰۲ء] کو دارالمصنّفین اور ماہنامہ معارف سے بڑا لگاؤ تھا اور تعلق مدۃ العمر باقی رہا۔ یہی نہیں دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اور اس کے اہل قلم اور مصنّفین مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] سے مولانا ضیاء الدین اصلاحی [۱۹۳۷-۲۰۰۸ء] تک سب سے علمی تعلقات قائم رہے۔ ان کی تحریریں بالخصوص ان کے مضامین اور مراسلات بڑے اہتمام سے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوتے تھے۔ خاص تعلق کا بنیادی سبب غالباً یہ تھا کہ دارالمصنّفین کا بنیادی کام سیرت پر ہے اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کا بھی اصل میدان سیرت نبویؐ ہی تھا۔ اس موضوع پر ان کی کتابیں اور تحقیقات نہایت عالمانہ اور بڑی اہمیت کی حامل ہیں جو ہماری تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھی جائیں گی۔ ماہنامہ معارف کے بارہ میں انہوں نے ایک خط میں لکھا کہ

> ''میں معارف کو دنیا کا سب سے بلند پایہ علمی رسالہ سمجھتا ہوں۔ وہ ہمارے تاریخ حال کا مستقبل میں ایک وثیقہ ایک ماخذ ہوگا۔ وہ مرجع انام ہے اور لوگ اب بھی، آئندہ بھی اس سے استفادہ کریں گے۔''

(تعارف دارالمصنّفین، ص ۱۹)

اسی تعلق کی بنا پر ایک بار وہ سید صاحب کے زمانہ نظامت میں شبلی منزل تشریف لائے، مگر سید صاحب موجود نہیں تھے اور نہ دارالمصنّفین ان کے آنے کا ذکر ہی سید صاحب نے معارف میں کیا ہے۔ اس کی تفصیل ان کے لٹریری اسسٹنٹ مولوی ابوعلی اثری [۱۹۰۳-۱۹۹۳ء] نے ایک عرصہ بعد مئی ۱۹۸۳ء میں ماہنامہ الرشاد میں شائع کی۔ اس میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب کا حلیہ، لباس اور سیرت نبویؐ سے متعلق کتب و مخطوطات اور مصادر کے مطالعے کا ذکر کیا ہے۔ اس میں مزار شبلی پر جا کر فاتحہ پڑھنے کا بھی ذکر ہے۔ یہ بھی تصریح کی ہے کہ سید صاحب موجود نہیں تھے۔ البتہ شاہ معین الدین احمد ندوی اور مولانا سید ریاست علی ندوی موجود تھے۔ شاہ صاحب نے

انہیں دیکھا نہیں تھا اور وہ ان کو پہچانتے بھی نہیں تھے، لیکن مولانا سید ریاست علی ندوی رفیق دارالمصنّفین سے ان کی ایک ملاقات تھی اور وہ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم سے اور ڈاکٹر صاحب ان سے بخوبی واقف تھے۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب شبلی منزل میں صبح سویرے آ گئے تھے۔ شام تک رہے۔ ظہر اور عصر کی نمازیں ادا کیں۔ اس کے بعد اسٹیشن واپس گئے، جہاں وہ اپنا سامان سفر اسٹیشن ماسٹر کے پاس رکھ آئے تھے۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے سفر ہندوستان کے منصوبے میں اعظم گڑھ کا سفر اور شبلی منزل جانا شامل نہیں تھا۔ وہ ٹرین سے شاہ گنج پہنچے تو انہیں یکا یک دارالمصنّفین کا خیال آیا اور وہ ٹرین سے اتر پڑے اور وہاں سے شبلی منزل آ گئے۔ روڈ ویز پر انہوں نے یکہ والوں سے دارالمصنّفین چلنے کو کہا تو سب انجان تھے اور کوئی سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ کہاں جانا ہے۔ ایک یکہ والے نے کہا کہ میں جان گیا کہ آپ کو کہاں جانا ہے۔ اس طرح اس یکہ والے نے انہیں دارالمصنّفین پہنچایا۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے ان سے کہا کہ

> ''آپ شاہ گنج سے تار کے ذریعہ اپنی تشریف آوری کی اطلاع دیدیتے تو ہم آپ کو لینے اسٹیشن آتے۔ فرمایا استغفراللہ، استغفراللہ، استغفراللہ، میں کوئی بڑا آدمی تھا کہ آپ حضرات کو اسٹیشن تک آنے اور اپنا خیر مقدم کرنے کے لئے زحمت دیتا۔ میں ایک بہت ہی معمولی طالب علم ہوں۔''
>
> (الرشاد۔ مئی ۱۹۸۳ء، ص ۵۲)

مولوی ابوعلی عبدالباری وہاں موجود تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''ان کے احترام و اجلال میں جب بھی کوئی بات کہی جاتی تو وہ تین مرتبہ استغفراللہ ضرور کہتے۔'' (ایضاً)

اس موقع پر ڈاکٹر حمید اللہ نے سیرت نبویؐ سے اپنی دلچسپی کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

> ''میں جب چھوٹا تھا اور صاحب شعور نہیں ہوا تھا تو میری والدہ جو

بڑی پرہیزگار، متقی، صالحہ اور عابدہ تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے قصے اور کہانیاں سنایا کرتی تھیں جو غیر شعوری طور پر دلنشیں ہوتی گئیں، اسی وقت میں نے فیصلہ کیا کہ میں جب پڑھ لکھ کر فارغ ہوں گا اور اللہ تعالی نے صاحب قلم بنایا تو اسی کو اپنا موضوع بناؤں گا۔ اس موضوع سے میری والہانہ دلچسپی تمام تر ماں کی تربیت کا فیض ہے۔'' (ایضاً)

مولوی ابوعلی اثری نے ڈاکٹر حمید اللہ کی دارالمصنّفین میں آمد کی پوری تفصیل لکھی ہے، مگر اس کے باوجود اگر آپ اس تحریر سے یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یہ کس سنہ کا واقعہ ہے تو آپ کو مایوسی ہوگی۔ ابھی تک معارف میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملا ہے۔

فیروز گاندھی

فیروز گاندھی [۱۹۱۲-۱۹۶۰ء] مشہور کانگریسی لیڈر اور پنڈت جواہر لال نہرو کے داماد اور سابق وزیر اعظم ہند آنجہانی اندرا گاندھی کے شوہر تھے۔ ایک بار پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ وہ بھی شبلی منزل آئے اور اس کے تاریخی مہمان خانہ میں قیام کیا۔

احمد سعید ملیح آبادی

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے صاحبزادے احمد سعید ملیح آبادی [۱۹۲۶-۲۰۲۲ء] سابق مدیر روزنامہ آزاد ہند کولکاتا ۱۹۴۵ء میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے طالب علم تھے۔ اس وقت ملک تقسیم کو لے کر اختلاف وانتشار کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اعظم گڑھ بھی اس سے متاثر تھا۔ مدرسۃ الاصلاح میں بھی نظریاتی اختلاف ہوا اور معاملہ اتنا بڑھا کہ مدرسہ بند کرنا پڑا۔ تمام طلبہ اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔ احمد سعید صاحب اپنے والد کے گہرے تعلق کی بنا پر مولانا سید

ریاست علی ندوی رفیق دارالمصنّفین کے پاس آ گئے جو اس زمانہ میں شہر میں رہتے تھے۔ شہر میں طاعون کی وبا پھیلی تو مولانا مسعود علی ندوی نے مولانا ریاست علی ندوی کو شبلی منزل بلا لیا۔ چنانچہ ان کے ساتھ احمد سعید صاحب بھی شبلی منزل آ گئے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں اس دور کے دارالمصنّفین کا احوال قلم بند کیا ہے۔

''مدرسۃ الاصلاح بند ہو جانے پر میں اعظم گڑھ چلا گیا۔ وہاں دارالمصنّفین میں مولانا ریاست علی ندوی تھے۔ وہ میرے والد کے دوستوں میں تھے۔ مولانا نے مجھے اپنے گھر میں ٹھہرا لیا۔ ان کے دو تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے، وہ سب مجھ سے بہت مانوس ہو گئے۔ مولانا کی اہلیہ نہایت خوش اخلاق اور سلیقہ مند خاتون تھیں۔ اپنے بچوں کے بڑے بھائی کی طرح مجھے محبت سے رکھا۔ میں انہیں چچی صاحبہ کہتا تھا۔ مولانا ریاست علی کی مالی حالت اچھی نہیں تھی مگر نئے مہمان کے آ جانے سے خاطر تواضع میں تکلف کیا جانے لگا۔ اس وقت مولانا شہر کے ایک محلے میں چھوٹے سے مکان میں تنگی سے رہتے تھے۔ میرا اضافہ ہونے سے تنگی اور بڑھ گئی۔ اچانک معلوم ہوا کہ شہر میں طاعون کی بیماری پھیل گئی ہے تو دارالمصنّفین کے مہتمم مولانا مسعود علی ندوی نے مولانا ریاست علی اور ہم سب کو شبلی منزل میں بلا لیا۔ مہمان خانہ کی نئی عمارت کے دو جانب دو مکان تھے، ایک مکان میں مولانا مسعود علی اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے، دوسرا مکان مولانا سید سلیمان ندوی کے لئے تھا۔ سید صاحب دارالمصنّفین چھوڑ کر بھوپال چلے گئے تھے۔ ان کے خالی مکان میں ہم لوگوں کو جگہ مل گئی، یہ کشادہ مکان تھا۔ کچھ عرصہ بعد شبلی منزل کے ایک دوسرے مکان میں مولانا ریاست علی کی فیملی کو منتقل کر دیا گیا تو مولانا مسعود علی نے مجھے مہمان خانہ کا ایک کمرہ رہنے کو دے دیا۔ یہ کمرہ ڈائننگ روم تھا، اب میرا رہائشی کمرہ بن گیا۔ اس کمرے کی کھڑکی شبلی کالج کے میدان کی

طرف کھلتی تھی اور کالج کی عمارت بھی نظر آتی تھی۔ سید سلیمان ندوی کے مکان کے پچھواڑہ باغ تھا جس میں الائچی کا ایک بہت اونچا درخت تھا، الائچیاں گرتیں اور زمین پر پڑی رہتیں۔اسی جگہ علامہ شبلی نعمانی کا مزار تھا اور قریب ہی ایک چھوٹی سی خوب صورت مسجد تھی۔نماز عموماً مولانا مجیب اللہ ندوی پڑھاتے تھے۔ملک میں فسادات کا دور شروع ہو چکا تھا۔فجر کی نماز میں مولانا مجیب صاحب دعائے قنوت پڑھنے لگے۔ان کی قرات بہت اثر انگیز تھی،ایک سماں بندھ جاتا تھا۔

دارالمصنّفین میں اہل علم وقلم کی ایک نامور ٹیم موجود تھی۔ مولانا ریاست علی کے علاوہ مولانا عبدالسلام، مولانا مجیب اللہ، مولانا شاہ معین الدین جیسے اکابر تھے۔مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن بیمار ہوکر علاج کے لئے اپنے گھر بہار چلے گئے تھے۔ مجھے ان کا ساتھ نصیب نہیں ہوا۔ دارالمصنّفین میں میرا قیام ایک طالب علم کی حیثیت سے تھا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ مدرسہ اصلاح بند ہوجانے کی وجہ سے تعلیم کا جو سلسلہ ٹوٹا تھا وہ دارالمصنّفین میں جڑ گیا۔تصنیف وتالیف کی مصروفیت کے باوجود مجھے مشاہیر اہل قلم سے استفادے کا موقع میسر آیا۔حدیث کا درس مولانا ریاست علی دیتے۔قرآن مجید مولانا مجیب اللہ ندوی پڑھاتے اور سمجھاتے ،(قرآن مجید کا درس کچھ مدت تک والد مولانا ملیح آبادی سے بھی لیا) عربی ادب مولانا عبدالسلام کے ذمے تھا،عربی ادب میں مولانا عبدالسلام کو مہارت حاصل تھی۔افسوس ہے کہ مولانا عبدالسلام سے میں زیادہ استفادہ نہیں کرسکا۔ وہ خفقان میں مبتلا تھے، لکھنے بیٹھتے تو قلم روانی سے چلتا مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد گھبرا کر اٹھ جاتے اور لان میں ٹہلنے لگتے۔ٹہلتے وقت چہرہ طرح طرح سے بناتے ،کچھ دیر بعد طبیعت سنبھلتی تو پھر اسی طرح لکھنے میں مصروف ہوجاتے ،متعدد قیمتی

کتابوں کے مصنف تھے۔ روزانہ سہ پہر میں پھول دار شیروانی پہن کر، ترکی ٹوپی لگا کر اور چھڑی لے کر شہر کی سیر کو پیدل نکل جاتے ،مئی جون کی گرمی میں کمرے کے اندر لحاف اوڑھ کر سوتے۔ میں نے مولانا ریاست علی کے لڑکوں کو ان کے پیچھے لگا دیا تھا۔ لڑکے سوتے جاگتے ''مولوی صاحب پپیہ'' کی صدا لگاتے تو بڑبڑاتے ''کیا فضول بات ہے'' غرض کہ مولانا عبدالسلام سے پڑھا کم کھلواڑ زیادہ کیا۔

دارالمصنّفین کا ماحول علمی اور تصنیف وتالیف کا تھا۔ ایک سے ایک علمی، ادبی اور مذہبی کتاب اس ٹکسال سے نکل کر آرہی تھی۔ ماہنامہ معارف بھی شائع ہو رہا تھا، اپنا پریس تھا، کتابیں اور رسالہ وہیں چھپتا۔ عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ یہاں مطالعہ کا مجھے بڑا اچھا موقع ملا۔ اور پر سے اہل علم کی مشفقانہ رہنمائی۔ رہنے کھانے کا اچھا انتظام ہو گیا تو اپنی پڑھائی اور مطالعہ میں پوری طرح لگ گیا۔ کھانا بہت اچھا ملتا تھا۔ انتظام شاہ معین الدین کا تھا۔ ناشتے یا کھنے پر اکثر ایک صاحب شریک ہوتے جو ''مولوی خستہ'' کہلاتے تھے۔ شہر میں ان کی بسکٹوں کی بیکری مشہور تھی، معروف شاعر اقبال سہیل بھی کبھی کبھا آجاتے تھے۔ مسلم لیگ کا زور بڑھتا جارہا تھا۔ اس کا اثر اعظم گڑھ شہر اور دارالمصنّفین پر بھی تھا۔ لمبی لمبی بحثیں حالات حاضرہ پر ہوتیں۔'' (میری صحافتی زندگی ص ۱۸-۲۰)

مولانا ڈاکٹر عبدالحق

افضل العلماء مولانا ڈاکٹر عبدالحق [۱۸۷۰-۱۹۵۸ء] پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نامور اہل قلم اور محقق تھے۔ وہ بھی ایک بار شبلی منزل تشریف لائے۔ مگر اس سلسلہ یا مولانا شبلی

وسلیمان اوردارالمصنّفین سے متعلق ان کے خیالات کا علم نہیں ہوسکا۔

(متاع رفتگاں،ص:۸۹)

شری پرکاش

شری پرکاش[م:۱۹۷۱ء] کانگریسی لیڈر اور پنڈت جواہر لال نہرو کے خاص احباب میں تھے۔ انگلستان میں زمانہ طالب علمی میں دونوں کے تعلقات استوار ہوئے تو مدۃ العمر باقی رہے۔ جدوجہد جنگ آزادی میں بھی دونوں ساتھ رہے۔شبلی منزل میں بھی دونوں ساتھ آئے اور اس کے تاریخی مہمان خانہ میں ٹھہرے۔(متاع رفتگاں ص ۱۶۵-۱۶۶)

مولانا عبدالمجید حریری

مولانا عبدالمجید حریری[م:۱۹۷۲ء] مدن پورہ بنارس کے باشندہ تھے۔قدیم و جدید دونوں علوم پر حاوی تھے۔علی گڑھ کے ممتاز طلبہ میں سے تھے۔خلافت اور نانکوآپریشن میں بڑھ کر حصہ لیا۔جدوجہد آزادی میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

ooo

[۹]

سخنوران شبلی

۲۰۱۱ء میں ناچیز کی کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' شائع ہوکر بحمد للہ بے حد مقبول ہوئی۔ ہندو پاک کے متعدد اہم نقادوں نے سراہا اور اسے شبلیات میں گراں قدر اضافہ قرار دیا۔ بعض احباب نے اس طرز پر دوسرے ادباء وشعراپر لکھی گئی منظومات اوران کا تذکرہ یکجا کرنے کی کوشش کی۔ یہ ہمارے ذخیرہ ادبیات میں ایک مفید کوشش تھی مگر ابتک اس نوع کی کوئی دوسری کتاب منظر عام پر نہیں آئی ہے۔

گذشتہ دس بارہ برس میں علامہ شبلی سے متعلق مزید منظومات لکھی گئیں اور متعدد قدیم منظومات جو پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت دستیاب نہیں ہوسکی تھیں وہ بھی دستیاب ہوئیں۔ خیال تھا کہ نئے ایڈیشن میں ان منظومات کو شامل کرلیا جائے گا، مگر اب تک اس کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت نہیں آئی اور حالات سازگار نہیں ہوئے۔اورکوئی اسے دوبارہ شائع کرنے کے لئے راضی نہیں ہوا۔اسے ہم اپنی بدقسمتی کہیں یا قدردانان شبلی کی عدم دلچسپی۔ بہرحال وقت کے ہاتھوں مجبور ہوکر بیان شبلی کے اس حصہ سوم میں ان نودریافت منظومات کوشائع کررہے ہیں۔ آئندہ دوسراایڈیشن جب شائع ہوگا تواس میں بھی ان اضافات کوجگہ دی جائے گی کہ یہ ان کی صحیح اوراصل جگہ ہوگی۔

بلاشبہ بڑی اہم نظمیں،قطعات اوردوسرے اصناف سخن میں ہمارے شاعروں نے علامہ شبلی نعمانی کوخراج عقیدت پیش کیا ہے۔اس میں نہ صرف ان کے علوئے مقام ومرتبہ پرروشنی ڈالی گئی ہے بلکہ ان کے عظیم الشان کارناموں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں جن شعرا کی تخلیقات کو

جگہ ملی ہے ان کا اندراج حروف تہجی کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔

سید آغا اشہر لکھنوی

سید آغا اشہر لکھنو کے ممتاز شعرا میں تھے۔ علامہ شبلی کی وفات پر ان کی ایک تعزیتی نظم روز نامہ زمیندار لاہور ۳؍دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے جو درج ذیل ہے:

اے شبلی اے گروہ افاضل میں نامور　　افسوس سب کو چھوڑ گئے داغ بر جگر
ماتم بپا ہے حلقہ ارباب علم میں　　کیا ہو رہا ہے ہند میں تم کو بھی ہے خبر
مانا کہ خلا مرجع ارباب فضل ہے　　تم نے ابھی سے باندھ لی کس واسطے کمر
دل سوز دین حق جو تمہیں یاد کرتے ہیں　　ہر نالہ جگر سے نکلتے ہیں کچھ شرر
مشتاق سیرت نبوی ساری قوم تھی　　اے ذی کمال وعالم تحریر وخوش سیر
اب وہ کتاب معرض تعویق میں رہی　　ہر سطر جس کی چاہتی ہے وسعت نظر
مداح ایک خلق ہے حسن کلام کی　　رکھتے تھے وعظ وپند تمہارے بہت اثر
پیغام موت بھی ہے عجب بانگ بے جرس　　تھا وہم بھی نہ ہم کو کہ نزدیک ہے سفر

خود خدمت رسول میں تنہا پہنچ گئے
ہندوستاں میں چھوڑ گئے سب کو نوحہ گر

(روز نامہ زمیندار ۳؍دسمبر ۱۹۱۴ء)

ڈاکٹر اخلاق بندوی

ڈاکٹر اخلاق احمد بندوی کا تعلق سر زمین اعظم گڑھ سے ہے۔ وہ ایک مردم خیز موضع بندی کلاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد شبلی نیشنل کالج سے انٹرمیڈیٹ اور بی اے پاس کر کے علی گڑھ کا رخ کیا۔ وہاں سے انگریزی میں ایم اے اور قانون کی اسناد حاصل کیں۔ اس

وقت سینٹ تھامس کالج شاہ گنج جون پور میں لکچرر ہیں۔

انہیں شعروادب سے فطری لگاؤ ہے۔ایک عرصہ سے شعروادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ان کی تخلیقات ملک و بیرون ملک موقرادبی رسائل وجرائد میں جگہ پاتی ہیں۔غزلوں کا ایک مجموعہ ''لمس'' شائع ہوکر مقبول ہو چکا ہے۔

اخلاق بندوی صاحب رچا ہوا پختہ ادبی وشعری شعور رکھتے ہیں۔غزلوں کے ساتھ نظموں میں بھی ان کے ذوق نے نکھار پیدا کیا ہے۔زیرنظر نظم میں وہ ایک پختہ مشق نظم نگار نظر آتے ہیں،حالانکہ اس نظم کو خود انہوں نے خراج عقیدت قرار دیا ہے اور بلاشبہ انہوں نے زبردست خراج پیش کیا ہے،مگر جذبات کی رو میں انہوں فن سے صرف نظر نہیں کیا ہے۔بہرحال یہ نظم اخلاق بندوی کی خراج عقیدت کے ساتھ ان کے فکروفن کا ایک خوب صورت نمونہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ متعدد رسائل کی زینت بن چکی ہے۔

علم شیریں ہے تو فرہاد ہیں شبلی صاحب

اے وطن خاک وطن یاد ہیں شبلی صاحب
تیرے ہرذرہ میں آباد ہیں شبلی صاحب

وہ سخنور ، وہ مصنف ، وہ مبصر شبلی
وہ مورخ ، وہ مبلغ ، وہ مدبر شبلی
وہ مجدد ، وہ محقق ، وہ مفکر شبلی
ہاں وہی گردش دوراں کے مفسر شبلی
ایک ہی فرد میں افراد ہیں شبلی صاحب
اے وطن خاک وطن یاد ہیں شبلی صاحب

تیرے ہرذرہ میں آباد ہیں شبلی صاحب

علم دنیا کی جہاں میں ہے جلائی قندیل
علم دیں جیسے خزینے سے بھری ہے زنبیل
ڈھونڈ کر لائے کہاں سے کوئی ان کی تمثیل
وہ نہ ہوتے تو بہت قوم کی ہوتی تذلیل
علم شیریں ہے تو فرہاد ہیں شبلی صاحب
اے وطن خاک وطن یاد ہیں شبلی صاحب
تیرے ہرذرہ میں آباد ہیں شبلی صاحب

ان کو کچھ کہئے تو اخلاق کا پیکر کہئے
بازوئے حضرت جبریل کا شہپر کہئے
صدف کوثر وتسنیم کا گوہر کہئے
کچھ نہ کہئے تو انہیں قوم کا رہبر کہئے
خامہ بر لوح کے استاد ہیں شبلی صاحب
اے وطن خاک وطن یاد ہیں شبلی صاحب
تیرے ہرذرہ میں آباد ہیں شبلی صاحب

اے خدا سر پہ فگن سایہ شبلی کردے
یا مجھے خاک کف پایہ شبلی کردے
میری ہر سانس کو سرمایہ شبلی کردے
اور مرجاؤں تو ہم سایہ شبلی کردے

قصر تہذیب کی بنیاد ہیں شبلی صاحب
اے وطن خاک وطن یاد ہیں شبلی صاحب
تیرے ہرذرہ میں آباد ہیں شبلی صاحب

ڈاکٹرایازاحمداصلاحی

ڈاکٹرایاز احمداصلاحی استاذ شعبہ اقتصادیات لکھنو یونیورسٹی مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے ہونہاراور لائق فرزند ہیں۔علم میں گہرائی اور مطالعے میں وسعت ہے۔متحرک اور فعال شخص ہیں۔ان کے قلم سے متعدد تحریریں نکل کر مقبول ہوچکی ہیں۔ان کی عمدہ نثر نگاری کا علم تھا مگران کی سخن سنجی کا علم اسی نظم سے ہوا۔یقین ہے وہ مشق سخن جاری رکھیں گے۔

علامہ شبلی پر ان کی نظم دراصل شبلی صدی کے موقع پر ان کا ایک عقیدت مندانہ خراج ہے،مگران کی نظم غلو ومبالغہ سے خالی ہےاور حقیقی شاعری کی ترجمان ہے۔

شبلی

عجب مرد قلندر تھا ، عجب اسلام کا شیدا
جو ٹھانا کرکے دکھلایا ، نہ سہا اور نہ گھبرایا

جسے تم کہتے ہوشبلی وہ باغ دیں کا مالی ہے　　جنید وشبلی و رازی و طوسی و غزالی ہے
نگوں باطل کا سر ہےاور ہر دشمن پرلرزہ ہے　　کہ شبلی نے حصار دیں کی دربانی سنبھالی ہے
وہ موج نورعرفاں ہے، وہ حق بینی کا منبع ہے　　بناء سیرت ختم الرسل جو اس نے ڈالی ہے
جہاں ایمان تازہ ہو ، جہاں اسلام زندہ ہو　　اسی کا نام سیرت ہے وہی کاوش مثالی ہے
وہ خود میں انجمن ہےعلم وحکمت کا دبستاں ہے　　وہ سید ہے،فراہی ہےوہ جوہر ہےوہ حالی ہے
جہاں وہ حامی ملت اٹھا تیغ دفاع لے کر　　وہاں سے اٹھ گیاباطل وہاں میدان خالی ہے

اذان حق سے اس کی ہر صنم خانے پہ لرزہ ہے وہ عاشق ہے رسول اللہ کا روح بلالی ہے
کہیں حسن بیاں حاوی کہیں سوز نظر شامل قلم کی اس کے ہر جنبش موثر ہے نرالی ہے
مجاہد ہے، مفکر ہے، وہ سچ میں مرد مومن ہے اسے کب فکر جاں ہے اسے کب حرص مالی ہے
حجازی روح کا مالک، امین غیرت ملی وہ ہندی ہے مگر اک داعی فکر ہلالی ہے
مناتے ہو مناؤ دھوم سے شبلی صدی لیکن رکے نہ وہ عمل جس کی بنا شبلی نے ڈالی ہے

جمال بھارتی

محمد عبدالشکور معروف بہ جمال بھارتی [۱۹/ذی الحجہ ۱۳۳۸-] بنیادی طور پر صحافی تھے۔ لیکن شعر وسخن میں درک حاصل تھا۔ ندوہ اور دیو بند میں تعلیم پائی تھی۔ پہلے فکر ندوی کے نام سے شاعری کرتے تھے۔ بعد میں جمال بھارتی کے نام سے فکر سخن کرنے لگے۔ صفی لکھنوی، عبدالباری آسی لکھنوی، جوش ملیح آبادی اور عکس امروہوی سے اصلاح سخن لی۔ رہنے والے تو مراد آباد کے تھے اور ابتدائی تعلیم وتربیت شاہ جہاں پور میں ہوئی مگر تحصیل علم کے بعد قیام بلیماران دہلی میں رہا۔ یہاں وہ عرصہ تک صحافت سے وابستہ رہے اور مختلف اخبارات (روزنامے اور ہفت روزہ) سے منسلک اور ادبی سرگرمیوں کا حصہ رہے۔ ۱۹۵۳ء میں دلی میونسپل کارپوریشن میں ملازمت اختیار کرلی اور وہیں سے سبکدوش بھی ہوئے۔ ان کا پہلا مجموعہ ''آئینہ جمال'' ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ ان کے درج ذیل مجموعہ کلام شائع ہوئے:

آئینہ جمال، طاؤس ورباب، آگ راگ، رخسار وکاکل، برق وشرر، کاروان آزادی، شخصیات، وفیات، دھڑکنیں، تاریخ کی عظیم خاتون اندرا گاندھی۔ وغیرہ آخر میں وہ ادبی دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔

غالباً ندوی ہونے کی وجہ سے علامہ شبلی سے بہت متاثر تھے۔ اور ان پر بڑی خوب صورت نظم لکھی ہے جو ان کے پہلے مجموعہ کلام ''آئینہ جمال'' میں شامل ہے۔

شبلی

چشمہ حسن فصاحت ہے بیان شبلی
جوہر لفظ و بیاں تیغ زبان شبلی

اللہ اللہ وہ تاریخ و تفکر پہ عبور
پرچم آرائے حقائق ہے نشان شبلی

بزم شبلی میں نہیں صرف تخیل کا گذر
فکر و تحقیق و تصوف ہے جہان شبلی

سیرت ختم رسل آپ کی تصنیف جمیل
وحی الہام عقیدت بزبان شبلی

شخصیت آپ کی تھی جامع اوصاف بشر
کیوں نہ ہو مہر بہ لب مرتبہ دان شبلی

عمر گذری بخدا خدمت اسلامی میں
جذبہ خدمت دیں روح روان شبلی

زندگی آپ کی تھی آئینہ عرفان وعمل
عالم رحمت وانوار تھی جان شبلی

اس کی تحریر حیات ابدی کی حاصل
ہر زمانہ ہے زمانے میں زبان شبلی

کیوں نہ ہو مدحت شبلی میں سراسیمہ جمالؔ
بزم کی بزم ہے جب زمزمہ خوان شبلی

(آئینہ جمال،ص:۶۷-۶۸)

زخ ش، نزہتؔ

زاہدہ خاتون شروانیہ نزہتؔ[۱۸۹۴-۱۹۲۱ء] کا ذکر ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' میں آچکا ہے۔انہوں نے وفات شبلی پر بڑی دلدوز حزنیہ نظم کہی تھی۔وہ نظم بھی 'شبلی سخنوروں کی نظر میں' میں شامل ہے۔علاوہ ازیں انہوں نے ایک قطع تاریخ بھی کہا ہے جو درج ذیل ہے:

کوکب مشرق

اک آفتاب ہوا آج عازم مغرب
بڑھا کے مرتبہ وشان و منصب مشرق

بھری تھی جس میں شراب مصیبت وکلفت
چھلک پڑا ہے وہ جام ملبب مشرق

وفات حضرت شبلی کی زاہدہ! تاریخ
کہو ''غروب ہوا آہ۔ کوکب مشرق''

۱۹۱۴ء

(فردوس تخیل،ص:۳۵۲)

ڈاکٹر سلمان عباسی

ڈاکٹر سلمان عباسی اردو کے ممتاز ادیب، شاعر اور محقق تھے۔ڈاکٹر ولی الحق انصاری کے زیر نگرانی ''غزالی مشہدی حیات اور کارنامے'' لکھ کر لکھنو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند لی۔ ان کے قلم سے متعدد کتابیں لمحوں کا سفر، کینوس کے رنگ، شش جہت، دس بجے رات کے بعد، بدیسی کہانیاں وغیرہ نکلیں اور مقبول ہوئیں۔''نوشتے'' ان کا شعری مجموعہ ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر سلمان عباسی نے علامہ شبلی کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

شبلی نعمانی

امتیاز زجاج و سنگ نہیں
اعتراف نگاہ تنگ نہیں
ورنہ ایسا کوئی صحیفہ کہاں
جس میں شبلی کا خاص رنگ نہیں

یوں جدت افکار کے نغمے چھیڑے
فنکار نے انداز کہن چھوڑ دیا
شبلی نے ادب کی تنگ راہوں میں

ہر موڑ پہ اک نکتہ فن چھوڑ دیا

علم سے باغ باغ تھے شبلی
ایک روشن چراغ تھے شبلی
ساری دنیا کو درس دیتے تھے
اتنے عالی دماغ تھے شبلی

عزت و احترام باقی ہے
اک نمایاں مقام باقی ہے
بھولتے جارہے ہیں اہل ادب
پھر بھی شبلی کا نام باقی ہے

نثر اردو کو اک روانی بخشی
اور نظم کو سطوت بیانی بخشی
حالی سرسید اور شبلی نے
مردہ اردو کو زندگانی بخشی

(نوشتے،ص:۱۹۱-۱۹۲)

عابدسلیمانی

عابدسلیمانی[پ:۳؍جولائی۱۹۶۲ء]محمدسلیمان صاحب کے صاحبزادے محلّہ فتن پورہ قصبہ کوپا گنج ضلع مئو کے رہنے والے ہیں۔علامہ شبلی کوانھوں نے ان اشعار سے خراج عقیدت

پیش کیا ہے:

کس قدر نیک نام تھے شبلی
واجب الاحترام تھے شبلی
ساری دنیا کو ناز تھا جن پر
ایسے عالی مقام تھے شبلی

آج روشن ہے زندگی کا چراغ
باد صرصر میں آگہی کا چراغ
بزم اردو میں تیری کوشش سے
جل گیا سیرۃ النبی کا چراغ

گیت الفت کا گا رہے ہیں ہم
فرض اپنا نبھا رہے ہیں ہم
جس پہ اردو کو ناز ہے عابدؔ
یاد اس کی منا رہے ہیں ہم

مولوی عبدالحی ماتریدی

مولوی عبدالحی ماتریدی [م: ۲۷ر رمضان ۱۳۴۸ھ] رئیس سہارن پور علامہ شبلی کے احباب میں تھے۔ وہ جب لکھنو میں مقیم تھے علامہ شبلی کی مجلسوں میں شریک ہوتے۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی:

''یہ دارالعلوم کا عجیب زمانہ تھا، مولانا شبلی مرحوم زندہ تھے۔ مولانا حمیدالدین

صاحب اور مولانا ابوالکلام صاحب کئی کئی مہینے آکر مولانا مرحوم کے پاس آکر رہتے تھے۔ اور ہر وقت علمی چہل پہل رہتی تھی۔ اس صحبت میں مرحوم (مولوی عبدالحی) بھی شریک رہتے تھے۔'' (یادرفتگاں، ص:۴۶)

مولوی عبدالحی نے اپنے عربی قصیدے میں علامہ شبلی کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے:

وسیدنا شبلی عین اوانہ   وخیر ذکی ناصح القوم فاصر

اخوافصل شمس العلم ان لہ   مصنفات کبارا ضمتا الدفاتر

فی عیش فی اصلاح قوم وما حلا   لہ العیش فیما شانھم الذخائر

(شبلی کا ذہنی ارتقاء صفحہ ۴۷۴-۴۷۵)

عزم سہریاوی

محترم جناب عزم سہریاوی اسی خطہ اعظم گڑھ کے ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ موضع سہریا ان کا وطن ہے۔ اردو کے ممتاز، خوش فکر اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ مختلف اصناف سخن پر انہیں عبور اور مہارت حاصل ہے۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے (سحاب رحمت، سدرۃ المنتہیٰ، مشعل راہ وغیرہ) شائع ہو کر اہل علم سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ انہیں علامہ شبلی سے فطری طور پر بڑا تعلق اور عقیدت ہے۔ ایک نظم میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

دیار شبلی

عظمت وشہرت ہے جس کی ہے بہت عزو وقار
دامن شبلی میں ہے قائم ابھی جس سے بہار

ہے ضیائے فہم ودانش ہر طرف پھیلی ہوئی

ہے اسی کے نور سے پرنور شبلی کا دیار

مرحلے خود ہی کئے تھے طے وہ جس نے سیکڑوں
ہے مثل صادق بھی اس پر ایک انار وسو بیمار

ساتھ سرسید کا پایا تھا اوائل عمر میں
ہاں مگر وہ مختصر ٹھہری علی گڑھ کی بہار

پھر سفر درپیش تھا کہ جانب ندوہ چلیں
پر فضائے ندوۃ العلماء نہ آئی سازگار

پھر تو خوشبوئے وطن بردوش آئی تھی نسیم
آنکھ کو ٹھنڈک ملی جس سے ہوا دل کو قرار

باندھ کر رخت سفر خاک وطن کو ہولئے
تھا نسیم صبح کو باد صبا کا انتظار

پھر فضائے صحن شبلی کی جنوں آرائیاں
رشک جس پر آج کرتی ہے عروس نو بہار

تھی بہم استاد اور شاگرد کی جلوہ گری
اب کوئی پیدل نہیں تھا اور نہ کوئی شہسوار

کام سیرت کا معظم تھا شروع اس نے کیا
اور سلیماں نے کیا تکمیل سے خود ہم کنار

اس اہم موضوع پر اس سے نہ بہتر تھی کوئی
اک کتاب محترم شرع نبی کی شاہ کار

جسد خاکی ہے وہیں شبلی کا پیوند زمیں
ہے اسی صحن زمیں پر وہ مزار خاک سار

کچھ دنوں پہلے ضیاء الدین تھے ناظم جہاں
گلشن شبلی کا تھا وہ بھی شجر اک سایہ دار

فروری سنہ ۸ میں جو حادثہ درپیش تھا
سیکڑوں انفاس کو جس نے کیا تھا سوگ وار

تھی بڑی بوجھل فضائے صحن شبلی اس گھڑی
روح فرسا کچھ سوا تھے گردش لیل ونہار

ہیں رفیقوں میں اسی کے اعظمی الیاس بھی
غازی کردار بھی ہیں ہے بہت جن کا وقار

ہے انہیں بے لوث الفت جس کی بزم ناز سے
ہے کوئی نعم البدل جو کیجئے اس کا شمار

غوطہ زن ہیں جس میں سارے عاشقان علم وفن
ہے اسی در سے رواں یہ فکروفن کی جوئے بار

گوشے گوشے سے جو آتے ہیں محبان چمن
اس کے حسن دید کو چلئے قطار اندر قطار

چاہیے چشم کرم تیری اے رب کائنات
صبح پو پھٹنے سے لے کر شام تک لیل ونہار

جس سے فیضیاب ہیں سب عاشقان علم وفن
ہے رواں اب بھی وہیں سے فکروفن کی آبشار

آن بان تاب وتب جو سب ہے عزم ناتواں
دامن شبلی میں قائم ہے اسی سے یہ بہار

ہے مری خواہش یہی شام و سحر ہوتی رہے
اے خدائے مہرباں تیری مہر ہوتی رہے
(مشعل راہ ص۲۰۹-۲۱۱)

عزیزلکھنوی

مرزا محمد ہادی عزیزلکھنوی[۱۸۸۲-۱۹۳۵ء] نامور شاعر تھے۔ مدۃ العمر دادسخن دیتے رہے۔ ان کے کئی مجموعہ کلام شائع ہوئے۔ ان میں گل کدہ اور انجم کدہ غزلوں کے مجموعے زیادہ مقبول ہوئے۔

علامہ شبلی سے تعلق خاطر تھا۔۱۹۱۴ء میں حالی وشبلی نے یکے بعد دیگرے وفات پائی تو انہوں نے دونوں کا مشترک مرثیہ کہا جوان کے مجموعہ ''اوراق عزیز'' میں شامل ہے۔

غروب الشمسین

(مرصیہ شمس العلما مولانا شبلی وشمس العلما مولانا حالی)

کیا ہے یہ نظم عالم فانی ۔۔۔ چند ذرات کی پریشانی
حد فاصل خرابہ ہستی ۔۔۔ نقش باطل وجود انسانی
اک خرابہ ہے عالم امکاں ۔۔۔ ہے کف خاک عالم فانی
ہے ازل سے سفینہ ہستی ۔۔۔ سیل موج فنا میں طوفانی
شام کب تک لباس غم پہنے ۔۔۔ یا ہو زیب سحر گریبانی
جلوہ افروز ہو ہزاروں سال ۔۔۔ لاکھ دکھلائے اپنی تابانی
خشک ہوجائے گا ضرور اک دن ۔۔۔ چشمہ آفتاب کا پانی
ہوگئے نقش سیمیائے فنا ۔۔۔ یکمائے فرنگ و یونانی
کیا ہوئے وہ جنہوں نے اے دنیا ۔۔۔ کی تھی بزم ادب میں حسانی
ہرزہ گوئی ہے لاف دانائی ۔۔۔ شیخ ہو یا معلم ثانی
نظرئے بدیہی الانتاج ۔۔۔ یہ طلسمات شکل جسمانی
کیا ہے ترکیب عالم اجسام ۔۔۔ امتزاج عناصر فانی

زندگی کیا ہے موت کی تمہید موت کیا ہے نشاط روحانی
اک سرا ہے یہ قالب خاکی اس پہ حیرانی و پریشانی
دشت قدرت کا ایک ذرہ ہے جس کو سمجھے ہیں عالم فانی
دیکھ کر رنگ مجلس دنیا بڑھتی جاتی ہے دل کی حیرانی
اک نظر بندی توہم تھا تخت کسریٰ و تاج خاقانی
اے فریب زمانہ غذار اللہ اللہ یہ فتنہ سامانی
آ! دم بھر میں کردیا پامال ایسی ہستی کو جو تھی لاثانی
اتنی تعجیل قتل کرنے میں تونے صورت بھی تو نہ پہچانی
جوش زن ہر طرف بیاباں ہے اف مرے غم کدے کی ویرانی
چند ذرے ملے مشابہ دل مدتوں میں نے خاک چھانی
کس طرح ہو بیان بالا جماں سرگذشت عزیز طولانی
دل افسردہ کیا سنا تو نے نہ وہ تو ہے نہ وہ غزل خوانی
بس کر اے جوش گریہ فرقت اب تو سر سے گذر گیا پانی
کن نگاہوں سے اہل فن دیکھیں آج دارالادب کی ویرانی
کیا جئے تھے یہ داغ اٹھانے کو کھل گئی اب تو یہ گراں جانی
میرا مطلب ہے نوحہ شبلی علم وفن کی ہے مرثیہ خوانی
جس پہ زیبا لباس غزالی جس کو شایاں کمال شروانی
نازش عہد حال و استقبال مفخر دودمان نعمانی
اس کی صورت گری کے آگے ہے سست رفتار خامہ مانی
اس کے زورِقلم سے کیا نسبت لاکھ دریا دکھائے طغیانی
لذت قند پارسی سے بڑھی اس کے خوان ادب کی مہمانی
ہم میں اور اس میں فرق اتنا ہے وہ ہے آزاد ہم ہیں زندانی

رات دن ہم ہیں اور غم شبلی
دل بے تاب و ماتم شبلی

اس سے وابستہ اس طرح تھے علوم　　جیسے باہم ہوں لازم وملزوم
اک زمانہ وہ تھا کہ دنیا میں　　ہر طرف علم وفضل کی تھی دھوم
بادۂ ناب جوش زن جس میں　　تھا ہر اک دل صراحی مختوم
علم کی ہر طرف حکومت تھی　　تھے کمربستہ اہل دل محکوم
ایشیائی علوم کی شمعیں　　جلوہ افروز بزم مثل نجوم
یا وہ عالم ہے اب کہ محفل میں　　شمع خاموش بے کسی کا ہجوم
آ! کب یہ سفر ہوا درپیش　　جب ہے قحط الرجال وقحط علوم
ہند ، اے ہند ، بخت برگشتہ　　یہ نحوست تری یہ طالع شوم
ضبط کرنا نہ اشک طوفاں خیز　　ڈوبتے ہیں ترے فلک کے نجوم
ایسے افراد اب کہاں ہوں گے　　ایسے لوگوں کی خلقت اب معلوم
آ! اے ہستی فنا تعبیر　　خوب سمجھتے تھے وہ ترا مفہوم
ان افادار گوہر افشاں سے　　ہوگیا ملک دفعتاً محروم
باغ ویران ہوگیا سارا　　آہ! کیسی چلی یہ باد سموم
ہم کو رونا ہے اپنی قسمت کا　　واہ رے بخت واہ رے مقسوم
ہوگئے وہ تو بند غم سے رہا　　ہم ہیں وابستہ قیود ورسوم
تا کجا چرخ کھائے گا اے چرخ　　تا کجے دل پہ یہ غموں کا ہجوم
کچھ تو دل کو قرار لینے دے　　اسے کرے اک ذرا ٹھہر کر گھوم
حد بھی ہے کوئی ان مظالم کی　　مٹ نہ جائے یہ ہستی منظوم
زہر میں کیا بجھی تھی تیری نگاہ　　جاس بلب ہوگیا دل مسموم
کیا صفات رکیک اے گردوں　　تیرے اخلاق میں نہیں مذموم

صبر کب تک کریں مصائب پر — ہم نہیں اسے فلک کوئی معصوم
چشمہ علم ہوگیا نایاب — تشنہ آب رہتے ہیں حلقوم
ہوں گے پیدا کہاں اب ایسے لوگ — ایک امید وہ بھی ہے موہوم
سعدی عصر ، حالی مغفور — اوحد الدہر شبلی مرحوم
تھا وہ اک شاعر گراں مایہ — یہ تھا اک عالم فنون وعلوم
ایسی امثال فائقہ کم یاب — ایسے افراد مستعد معدوم
درخور مدح ان کی تصنیفات — قابل ذکر ان کے فیض عموم
سچ ہے مردہ پسند ہے دنیا — ہے ازل سے زمانے میں مرسوم
قدر کی ملک نے مگر کم کی — تھے وہ بے شک جواہر مکتوم
عمر بھر قوم کے رہے خادم — جب ہوئے جاکے خلق میں مخدوم
کیوں پلٹ کر بھلا وہ آئیں گے — جب نہیں ہے اعادۂ معدوم
سن کے یہ واقعات عبرت ناک — کون ایسا ہے جو نہیں مغموم
گوہر اشک دیدۂ خوں بار — رشتہ نظم میں ہوئے منظوم
سال تاریخ پر ہے ختم سخن — لوح دل پر جو یوں ہوئی مرقوم

شمعیں افسردہ بزم ہے خالی
غم شبلی بماتم حالی

۱۹۱۴ء

(اوراق عزیز، ص:۳۵-۳۸)

مولانا سید علی زینبی

روزنامہ زمیندار لاہور ۲۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے مولانا سید علی زینبیؒ استاذ ادب عربی

ندوۃ العلماء لکھنو کا فارسی زبان میں طویل قطعہ تاریخ وفات شائع ہوا ہے۔ جو درج ذیل ہے:

دوش رفتیم سوئے دارعلوم ندوہ　　که ہمان است بجا کعبہ روسانی ما
ماند اینم چہ چیز است کہ مارا بکشید　　جذبہ داشت مگر سورش پنہانی ما
حسرت آلود بہر سمت نظر ہا کردیم　　درو دیوار جزدا و ز بے جانی ما
اندریں کلبہ احزاں چہ تو آں گفت زبود　　ہر درے نوحہ گر بے سرو سامانی ما
بعد ازاں ز جلہ دیدیم بخاک افتادہ　　ہمہ مصروف بزاری و عزا خانی ما
ایں گروہ طلبہ بود کہ نوحہ می کرد　　بر زبوں بختی خود و در پریشانی ما
گفتم اے دوش نشینان ملائک چہ بود؟　　ہمہ گفتند فتاد افسر شاہانی ما

خواستم صاف بگویند جوابم آمد
کہ بگو رفت ز ما شبلی نعمانی ما

۱۳۳۲ھ

حاجی محمد عبدالقادر

حاجی محمد عبدالقادر مرحوم وکیل (کتواپورہ) بنارس، مولف گلزار قادری، سفرنامہ حجاز، تاریخ سعید وغیرہ کہنہ مشق ادیب وشاعر تھے۔ نظم ونثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اور دونوں میں ان کی مطبوعہ یادگاریں ہیں۔ تاریخ گوئی میں انہیں خاص مہارت حاصل تھی۔ پچاسوں اہل شعرو ادب اور ارباب کمال کی تاریخیں کہی ہیں جو ان کی کتاب ''رہنمائے تاریخ اردو'' میں شامل ہیں۔ اس میں ایک علامہ شبلی بھی ہیں:

اپنا ثانی نہ رکھتے تھے کوئی　　فرد یکتا یگانہ شبلی تھے
مصرعہ سال فوت لکھ رحمت　　اوستاد زمانہ شبلی تھے

۱۳۳۲ھ

(رہنمائے تاریخ اردو،ص:۸۱)

مولوی مرغوب احمد دہلوی

مولوی مرغوب احمد دہلوی نے ندوے کی تعریف میں ایک عربی قصیدہ لکھا ہے جس میں مولانا شبلی کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں:

والندوۃ العلما علی ندوات غیرھم ولو فوت الیاء والمقنے

فاقت علوا معل منافاقت ذکا ء علی النجوم و مخلھا حاز المربے

برکاتھا انشترف حوالی مصرھا ففدت مفتحنہ الابواب المعے

وقوامھا الشبلی ذالبحر العلو م البارع اطبر النیل المقعدے

فبعیہ جات کروض باسم الا زھار فی حسن المناظر والشا

فسعود ھالا زوال واداو محیاھا حیا وجودھا ری الصدے

(شبلی کا ذہنی ارتقاء صفحہ ۴۷۴-۴۷۵)

مشتاق احمد بیدلؔ

مشتاق احمد بیدل صاحب شہر مئو کے لائق فرزند اور خوش فکر شاعر ہیں۔ اردو و فارسی دونوں زبانوں میں دادِ سخن دیتے ہیں۔ اصلاً نظم نگار ہیں اور نظمیں خوب کہتے ہیں۔ خاص طور پر ملی اور سیاسی موضوعات پر ان کی نظمیں متاثر کرتی ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ''فکر بیدل'' ۲۰۱۳ء میں مئو سے شائع ہو چکا ہے۔

فکر بیدل میں انہوں نے متعدد شخصیات کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس میں ایک نظم علامہ شبلی کی شخصیت پر بھی شامل ہے اور قابل ذکر ہے۔

نذر علامہ شبلی نعمانی

اے چرخ علم وفن کے فروغ مہ تمام
حق نے عطا کیا تھا تجھے رونق دوام

ہر جملہ تیرا دانش و حکمت کا باب ہے
تیری روش پہ چل کے ہر ایک کامیاب ہے

اک فکرنو ملی ترے فکر وشعور سے
روشن ہے بزم تیری تجلی کے نور سے

فکر حیات گیر تھی تیرے قلم کی رو
پہنچی ہر اک مقام پہ تیرے ہنر کی ضو

بخشا ہے تو نے ہم کو جنوں خیز ولولہ
علم کلام کیا ہے تری ذات سے ملا

تو آپ اپنی ذات سے تھا ایک انجمن
سب سرنگوں تھے تیرے تئیں قدردان فن

سیرت نگاری پر ترا احسان عام ہے
خاکہ نگاری تیرے قلم پر تمام ہے

علم بدیع کیا یہ ہم کو بتا دیا
اصناف نظم و نثر سراپا سکھا دیا

معراج خامہ سیرت ''نعمان الکلام''
ہے''سیرت النبی'' و''غزالی'' کا فیض عام

گذرا ہے فن نقد کی حد کمال سے
بزم ادب میں نور ہے تیرے جمال سے

تنقید کا اصول تیرے فن کی آبرو
اس فن میں تیری خوب رہی سعی و جستجو

تو بن کے ابر زیست اسی خاک سے اٹھا
اک تاجدار فن محاکات کا بنا

دارالمصنّفین تری یادگار ہے
جس سے ہمارے خطے میں آئی بہار ہے

اسلاف کے طریق کا میں پاسدار ہوں
لیکن وطن میں اپنے غریب الدیار ہوں

اے فکر دل پذیر مرے شاہد سخن
مثل خذف ہے شہر میں اپنی متاع فن
(فکر بیدل۔ص:۲۱۳-۲۱۵)

مضطرا عظمی

مقیم الدین مضطراعظمی [۱۹۳۴-۲۰۱۹ء] کہنہ مشق شاعر تھے۔ وہ ۲؍فروری ۱۹۳۴ء کو اترپردیش کے مردم خیز ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں راجہ پورسکرور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ پھر شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ سے بی اے کیا۔ تلاش معاش میں بھیونڈی چلے گئے۔ پوری زندگی وہیں گذاردی اور پھر اسی کی خاک میں آسودہ ہوئے۔

مضطراعظمی نے ۱۹۷۰ء میں شاعری کا آغاز کیا۔ ہوش نعمانی سے مسورہ سخن کیا۔ ان کے تین شعری مجموعے (اضطراب، الہام اور شمار چھالوں کا) شائع ہوئے، جن کی اہل شعروادب نے بڑی پذیرائی کی۔ انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی۔ البتہ نظم نگاری میں انہیں زیادہ مہارت حاصل تھی۔ علامہ شبلی پر انہوں نے دو نظمیں کہی ہیں اور دونوں لائق مطالعہ ہیں:

انوار شبلی

شوق ہے لکھنے کا لیکن دل میں چبھتی ہے یہ بات
میرا کم مایہ قلم اور شبلی نعمانی کی ذات

قوم وملت کے معالج علم ودانش کے وقار
جنت الفردوس میں جا دے پروردگار

ذہن کی تیرہ شبی کو تو نے روشن کردیا
گاؤں کے سنسان کوچے علم وفن سے بھر دیا

تو نے اپنے خون سے سیراب کی پیاسی زمیں
پھول کھلتے ہیں ہزاروں اب چمن میں دل نشیں

سنگ ریزے چھا گئے روئے زمیں پر چار سو
بن گئے ہیں کچھ ستارے فکر و فن کی آبرو

آج بھی امید کے روشن ہزاروں ہیں چراغ
اعظمی لکھتے ہیں کچھ اس دور کے بہتر دماغ

شبلی کالج شبلی منزل ہیں وطن کی آبرو
طالب علم و ہنر ہوتے ہیں یاں پر سرخرو

آل اعظم گڑھ کو اک سچا نگینہ دے دیا
ہم کو بحر زندگی میں اک سفینہ دے دیا

چھپ گیا سورج مگر روشن ستارے کر گیا
بے سہاروں کے سفینوں کو کنارے کر گیا

تیری ادبی کاوشوں میں ایک النعمان ہے
جو تری علمی لیاقت کی کھلی پہچان ہے

تو نے الفاروق لکھ کر ہم کو دکھلائی ہے راہ
راز ہستی کے لئے جو ہے مکمل درس گاہ

تو نے المامون لکھ کر عدل زندہ کردیا
دامن تاریخ مسلم موتیوں سے بھر دیا

سیرت ختم الرسل کو پانچ جلدوں میں لکھا
تیرہ و تاریک ذہنوں میں اجالا کردیا

اک سمندر کو نئے کوزے میں تو نے بھر دیا
چاندنی سے سارے عالم کو منور کردیا

تو نے قائم کردئے ملی ادارے پر وقار
جن کے دم سے ہے ہمارے باغ میں فصل بہار
خواب تھا ملت کا ندوہ تو نے اک تعبیر دی
لکھنو کی سرزمیں کو دین کی شمشیر دی
بات کچھ ایسی ہوئی کہ میل دل میں آ گیا
اس بہانے جائے پیدائش بھی صدقہ پا گیا
مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد کا پتھر ہے تو
جس نے پختہ کردیا ہے راہ ورہبر ہے تو
شبلی کالج کی بدولت یہ زمیں زرخیز ہے
رنگ پھولوں کا درخشاں روپ دل آویز ہے
اک ادارہ کر گئے قائم قلم کاروں کے نام
شبلی منزل آج تک ہے اہل دانش کا مقام
ہر قدم پر تھے فراہی اس سفر میں ہم رکاب
تیرے سائے میں ہوئے مقصد میں اپنے کامیاب
تیرے اک بے لوث خدمت گار تھے عبدالسلام
مل گیا سید سلیماں کو یہاں سے اک مقام
چن لئے موتی ترے دامن سے کچھ آزاد نے
کردیا مسعود کو اک آسماں استاد نے
ایک تھے اقبال خاں جن کا تخلص تھا سہیل
شیریں لہجے میں کیا کرتے تھے کلیل
مجلس اخوان کی بھی ہوگئی تشکیل یوں
بعد مرشد حکم مرشد کی ہوئی تکمیل یوں

بن گئے حضرت حمیدالدین میر کارواں
مل گئی سید سلیماں کو نظامت کی کماں
ساتھ میں تھے پیکر معصومیت عبدالسلام
جن کی علمی کاوشوں نے پا لیا اعلی مقام
پھر معین الدین صاحب آگئے میدان میں
چند پھولوں کا اضافہ کر گئے گلدان میں
وقت آخر آگیا تو ہو گئے وہ بھی جدا
پھر میاں مسعود بن کر آگئے تھے ناخدا
آخرش مہمان تھے جانا پڑا مرشد کے پاس
جس جگہ جانے میں مومن کونہیں خوف وہراس
ذکر نہ کرنا غلط ہوگا صباح الدین کا
ان کی بھی خدمات ہیں سامان ہے تسکین کا
اور بھی اہل وفا اس بزم میں آتے رہے
پرچم علم و ادب دنیا میں لہراتے رہے
اب ضیاء الدین کا محفل میں جلتا ہے چراغ
مانے جاتے ہیں وہ اپنے دور کے بہتر دماغ
حشر تک قائم رہے علم وادب کا یہ نشاں
اس دعا پر ختم کرتا ہوں میں اپنا بیاں
بزم شبلی کا اگر مل جائے تھوڑا اعتبار
پھر دل مضطر کو آجائے گا اک پل میں قرار

(الہام ص۱۷۱-۱۷۵)

گلزارشبلی

مرکز فیضان شبلی تیری عظمت کو سلام
تیری خوشبو سے معطر ہے گلستاں کا نظام

شبلی کالج مہر وماہ آسمان زندگی
بے بہا دانش کدہ ایوان علم وآگہی
غنچہ عزم و صداقت روح میں پاکیزگی
ریگ زاروں کے لئے اک چشمہ آسودگی

حشر تک پیتے رہیں گے رند بیداری کا جام
مرکز فیضان شبلی تیری عظمت کو سلام

طالب علم وہنر کے حق میں روشن ایک کل
رات کے پر ہول سناٹوں میں اک بانگ دہل
کوہ جیسی سربلندی باز کا عزم وعمل
بحرحکمت کا شناور روپ میں نازک کنول

جہل کی شیشہ زنی سے اک مسلسل انتقام
مرکز فیضان شبلی تیری عظمت کو سلام

تو سمندر علم کا ہے تیری وسعت بیکراں
حشر تک قائم رہے یہ علمیت کا آسماں
تجھ پہ ہوتا ہے ہمیں اک ماہ کامل کا گماں
ہر اندھیرے موڑ پر تیرا کرم ہے ضوفشاں

اس زمیں سے آسماں تک عقل ہے محوخرام
مرکز فیضان شبلی تیری عظمت کو سلام

زندہ باد اے شبلی کالج تیری عظمت زندہ باد
قوم وملت کو متاع علم سے کرتا ہے شاد
آج تک بھولے نہیں ہم جام صہبا کا سواد
آج بھی تیرے کرم سے ہورہے ہیں بامراد
گلشن ہستی میں ہم کو مل گیا تھوڑا مقام
مرکز فیضان شبلی تیری عظمت کو سلام

شبلی نعمانی کے خوابوں کی حسیں تعبیر تو
آنے والے کل کی اک رنگیں سی تصویر تو
قومی یکجہتی کا ہے اک مرکز دلگیر تو
فرض کے گھر میں مقید علم کی تنویر تو
علم کے دریا سمندر ہیں ترے سابق غلام
مرکز فیضان شبلی تیری عظمت کو سلام

تو کہ مولانا حمیدالدین کی ہے آرزو
تو بشیر و شوکت سلطان کی ہے جستجو
بوالحسن نے بھی پلایا ہے تجھے اپنا لہو
غوث عالم داؤدی بھی ہورہے ہیں سرخرو
علم کی شمشیر تیری ہے سدا سے بے نیام
مرکز فیضان شبلی تیری عظمت کو سلام

دل یہ کہتا ہے خرد کا آستانہ چوم لوں
غیرت شبلی کا بخشیدہ خزانہ چوم لوں
میکدے کا سوز الفت ساحرانہ چوم لوں
جام صہبا کا تموج کافرانہ چوم لوں

جذبہ دل آج مضطر ہورہا ہے بے لگام
مرکز فیضان شبلی تیری عظمت کو سلام

(الہام ص ۱۶۷-۱۶۹)

نثار اعظمی

نثار احمد انصاری معروف بہ نثار اعظمی موضع املو ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالحمید انصاری ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ہائی اسکول مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے کیا۔ انٹرمیڈیٹ یوپی بورڈ سے کیا۔ بی اے اور ایم اے کی اسناد لکھنو یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ اس کے علاوہ جامعہ اردو سے ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل پاس کیا۔ منشی، کامل، مولوی، عالم، فاضل ادب کی اسناد عربی فارسی بورڈ الہ آباد سے حاصل کیں۔ لکھنو یونیورسٹی کا امتحان فاضل ادب بھی پاس کیا۔ تحصیل کے ساتھ اتر پردیش اردو اکادمی میں ملازمت بھی کرتے رہے۔ بعد ازاں ان کا تقرر بحیثیت لکچرر شعبہ عربی لکھنو یونیورسٹی میں ہوا۔ یہیں سے سبکدوش ہو کر لکھنو میں مقیم ہیں۔

نثار اعظمی نے نظم ونثر دونوں میں اپنی صلاحیت دکھائی ہے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام ''رخت سفر'' عرصہ ہوا مہر پبلشرز لکھنو سے شائع ہو چکا ہے۔ جس میں ان کی ایک نظم ''شبلی'' شامل ہے۔ یہ نظم علامہ شبلی کو ایک عمدہ خراج ہے۔

شبلی

وہ مرد تازہ کار کہ شبلی کہیں جسے
ہم کو عطا کی اس نے متاع یقین وہوش
دامن تھا جس کا گوہر شہوار کی دکاں
ساغر میں جس کے تھا مئے خود آگہی کا جوش

اس کے حریف اور مورخ بھی تھے مگر
شبلی میں جو تھی بات وہ اوروں میں تھی کہاں
تاریخ کا معلم اول وہ تھا عیاں
حالات جس نے صدق وصفا سے کئے رقم
بے شک وہ عہد نو کا تھا اک صاحب قلم

اس نے ادب ،سیاست ومذہب کے راستے
اپنی بلند فکر ونظر سے کئے تھے طے
وہ مطرب چمن ، وہ مغنی خوش نوا
گونجی عجم سے دور عرب میں بھی جس کی لے

نقاد تھا ،مورخ و مصلح تھا وقت کا
انسان تھا عظیم ، مصنف تھا باوقار
اس نے عروس فکر کو بخشا یہ حسن ورنگ
آج اس کے دم سے گلشن اردو ہے لالہ زار

مولوی سید نواب علی ایم اے

پروفیسر سید نواب علی پروفیسر بڑودہ کالج کی تعزیتی نظم روزنامہ زمیندار لاہور یکم دسمبر ۱۹۱۴ءکو شائع ہوئی ہے۔علامہ شبلی سے ان کے گہرے مراسم تھے۔انھوں نے یہ نظم میرزا غالب کی زمین میں کہی ہے۔نظم حسب ذیل ہے:

آہ!شبلی

کرنا نہیں اے ملک الموت تقاضا کوئی دن اور　　شبلی کو ابھی چھوڑ خدارا کوئی دن اور
پھر کس کے قلم میں ہے یہ قدرت کہ لکھے گا　　سیرت کو تو ہو جانے دے پورا کوئی دن اور
صد حیف کہ سنتا ہی نہیں تو تو کسی کی　　فرمان خدا ٹل نہیں سکتا کوئی دن اور
ہیکل کو سلیماں نے تھا اس طرح بنایا　　مرکر بھی عصا کا تھا سہارا کوئی دن اور
یوں کس نے چھپایا ہے اسے خاک میں افسوس　　شبلی بھی وہی رنگ دکھاتا کوئی دن اور
مانا کہ بہت شاق تھی اسحاق کی فرقت　　تم قوم سے کرتے نہ کنارا کوئی دن اور
سب سے نفرت سہی اور خلق سے وحشت　　ندوہ کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

روزنامہ زمیندار یکم دسمبر ۱۹۱۴ء

پروفیسر سید نواب علی صاحب کی تعزیتی نظم اوپر گذر چکی ہے۔ انھوں نے علامہ شبلی کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ بھی کہا ہے جو یکم دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ فرماتے ہیں:

شد چو از دنیائے دوں سوئے جہاں
شبلی آں علامہ عالی ہمم
کلک نواب از پئے تاریخ فوت
''ابن رشد الہند رفتہ'' زور قلم

۱۳۳۲ھ

وارث ریاضی

مولانا وارث حسن معروف بہ وارث ریاضی [م: ۲/اکتوبر ۱۹۴۹ء] دیوبند کے فاضل

(۱۹۶۵ء)اور نہایت ممتاز شاعر و ادیب ہیں۔اصلاً دبستان شبلی کے شاعر ہیں۔نظم ونثر دونوں پر یکساں قدرت ہے، تاہم اپنی شاعری کے لئے معروف ہیں۔شعری مجموعہ ''حرف آرزو'' اور مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہو چکے ہیں۔ان کی ادبی تخلیقات مجلّات بالخصوص ماہنامہ معارف میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

شبلی صدی کے موقع پر ایک نظم میں انہوں نے علامہ شبلی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جو ماہنامہ معارف کے شبلی نمبر میں شائع ہوئی ہے۔

نذر علامہ شبلی نعمانی

وہ جس کی شخصیت تھی کاشف اسرار قرآنی
کرے گی ناز صدیوں جس پہ بزم علم وعرفانی

وہ شبلی عالم وسیرت نگار رحمت عالم
وہ شبلی آسمان آگہی کا نیر اعظم

وہ شبلی حجت اسلام تھا ، حکمت کا داعی تھا
وہ ابن رشد تھا ، اپنے زمانے کا وہ رازی تھا

وہ شبلی جس نے کی دنیائے فکروفن پہ سلطانی
مگر پھر بھی نہیں تھا اس کو دعوائے ہمہ دانی

وہ شبلی نازش شعر و ادب تنقید کا بانی
جہان نثر میں ملتا نہیں اس کا کوئی ثانی

فصاحت اس کی تحریر رواں پر ناز کرتی ہے
بلاغت اس کے اسلوب بیاں پر ناز کرتی ہے

تخیل کی فراوانی پہ حیرت ہے زمانے کو
خطابت پر ، سخن دانی پہ حیرت ہے زمانے کو

وہ سرسید کا ہم سر قوم کا رہبر مفکر تھا
مورخ تھا ، محقق تھا ، مصنف تھا ، مدبر تھا

ہوئے ہیں فیض سے اسکے ہزاروں دیدہ ور پیدا
مصنف ، اہل دانش اور اصحاب نظر پیدا

کبھی ویراں نہیں ہوگا بسایا ہے چمن ایسا
خزاں اس میں نہ آئے گی سجایا ہے چمن ایسا

رہے آٹھوں پہر گردش میں فکروفن کا پیمانہ
رہے آباد وارث حشر تک شبلی کا میخانہ

(ماہنامہ معارف شبلی نمبر،ص:۴۷۵)

ooo

کتابیات

کتب

- آثار شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء
- آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔مولانا ابوالکلام آزاد، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۸
- آئینہ جمال۔جمال بھارتی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی،۱۹۶۲ء
- اپر پرائمری ریڈر۔قاضی عبدالرحمٰن حیرت، معارف پریس اعظم گڑھ،۱۹۲۹ء
- اثرات شبلی (اول ودوم)۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۲۲ء
- اسکات المعتدی علی انصات المقتدی۔علامہ شبلی نعمانی، نظامی پریس کان پور،۱۲۹۸ھ
- اسوۃ الرسولؐ (اول تا پنجم)۔سید اولاحید رفوق بلگرامی، نظامی پریس لکھنو،
- اعظم گڑھ کا سوادھینتا سنگرام (اول ودوم)۔پھول بدن سنگھ، اعظم گڑھ،۱۹۷۴ء
- افکار ذاکر۔اختر الواسع، فرحت احساس، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ دہلی، فروری ۲۰۰۵ء
- اقبال اور دبستان شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء
- المامون۔علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع سوم،۱۹۹۲ء
- المیزان۔سید نظیرالحسن فوق رضوی، مطبع فیض عام، علی گڑھ،۱۹۱۴ء
- الہام۔مضطر اعظمی، نثار پبلی کیشن بھیونڈی،۲۰۰۲ء
- انتخاب رسائل شبلی۔ایوان اردو پٹنہ،۱۹۶۲ء
- انتخاب رسائل شبلی۔ناشر: ایوان اردو پٹنہ،۱۹۶۲ء

- انتخاب کلام اقبال سہیل، مولانا ضیاءالدین اصلاحی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۸۹ء
- اوراق عزیز۔ عزیز لکھنوی، مرتبہ حیات لکھنوی، عزیز لکھنوی یادگار کمیٹی، امامیہ ہال، پنچکوئیاں روڈ نئی دہلی، ۱۹۹۹ء
- بزم رفتگاں دوم۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء
- بزم رفتگاں اول۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۸۱ء
- بیان شبلی حصہ اول، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۲۰ء
- بیان شبلی حصہ دوم۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۲۲ء
- بیسویں صدی کے شعرائے دہلی حصہ اول، عظیم اختر، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۵ء
- پروانہ چراغ مزار خدیم ما۔ حکیم محمد اسحاق، مرتبہ ڈاکٹر شعیب اعظمی، اعظم گڑھ
- تصانیف شبلی کے تراجم۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۲۱ء
- تکملہ حیات سعدی، مولانا محمد عبدالسلام خاں رام پوری، رام پور
- حالی، شبلی اور آزاد۔ ڈاکٹر چمن لعل بھگت، میزان پبلشرز سری نگر کشمیر۔ ۲۰۰۸ء
- حسن البیان فی مافی سیرۃ النعمان۔ محمد عبدالعزیز محمدی، مطبع فاروقی دہلی، ۱۳۱۱ھ
- حیات دبیر۔ سید افضل علی ضوؔ، جارج سٹیم پریس لاہور، ۱۹۱۵ء
- حیات شبلی۔ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء
- حیرۃ الفقہ۔ قاضی عبدالرحمٰن حیرت، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۲۹ء
- خطبات شبلی۔ مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۴۱ء
- خطبات شبلی نو دریافت۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۲۱ء
- خلاصہ انتخابات شبلی۔ آقائے رازی، ایم فرمان علی لاہور، س ن
- دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۲ء
- دستاویزات محسن الملک۔ پروفیسر اقبال حسین، سرسید اکیڈمی مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء

- دوکوزہ گر۔ڈاکٹر زاہد منیر عامر،قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل،لاہور۔۲۰۲۱ء
- رخت سفر۔نثار اعظمی،مہر پبلشرز نامی پریس بلڈنگ لکھنو۔
- ردالموازنہ۔میر افضل علی ضو۔مطبع تصویر عالم لکھنو،۱۹۰۸ء
- رسائل شبلی۔علامہ شبلی نعمانی،دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء
- روداد جلسہ سال دوم،ندوۃ العلماء ۱۸۹۵ء،مطبوعہ انتظامی لکھنو،
- روداد جلسہ سال سوم،ندوۃ العلماء ۱۸۹۶ء،مطبع اصح المطابع لکھنو،
- روداد جلسہ چہارم ندوۃ العلماء،۱۸۹۷ء،مطبوعہ انتظامی لکھنو،۱۸۹۷ء
- رہنمائے تاریخ اردو۔حاجی محمد عبدالقادر،معارف پریس اعظم گڑھ،۱۹۳۸ء
- سخن ہائے گسترانہ۔مشفق خواجہ،مرتبہ انور سدید،فضلی سنز،کراچی،۲۰۰۷ء
- سیرۃ النعمان۔علامہ شبلی نعمانی،دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۱۹۹۹ء
- شبلی:اقتباسات کی روشنی میں۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۲۲ء
- شبلی اور جہان شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء
- شبلی:خودنوشتوں میں۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۹ء
- شبلی:سخنوروں کی نظر میں۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۲ء
- شبلی کا ذہنی ارتقاء۔سید سخی احمد ہاشمی،مجلس یادگار ہاشمی کراچی،۱۹۹۵ء
- شبلی کے مکتوب الیہ۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۲۲ء
- شذرات سلیمانی(اول تا سوم)۔دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء
- شذرات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء
- ظل الغمام فی مسئلۃ القرات خلف الامام،علامہ شبلی نعمانی،مطبع نظامی کان پور،۱۲۹۹ھ
- عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات۔ڈاکٹر گلشن طارق،مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی،۲۰۱۴ء
- عطیہ شبلی۔اکبر علی خاں عرشی زادہ۔مرتبہ ڈاکٹر ممتاز عرشی،مولانا عرشی میموریل سوسائٹی،

رامپور،۲۰۲۰ء
- علامہ آخر الزماں۔مولوی محمد عماد الدین شیر کوٹی،مطبع قاسمی دیوبند،۱۳۳۲ھ
- علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ،۲۰۰۱ء
- علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا،طبع اول:۲۰۲۱ء
- علامہ شبلی کے فارسی خطوط ایک مطالعہ۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی،۲۰۲۱ء
- علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۳
- فردوس تخیل۔زخ ش۔دارالاشاعت پنجاب لاہور ۱۹۴۱ء
- فکر بیدل۔مشتاق احمد بیدل،مئو،۲۰۱۳ء
- قد اور سائے۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۹ء
- کاروان رفتہ۔ڈاکٹر محمد ایوب قادری،اسلوب کراچی،۱۹۸۳ء
- کتابیات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء
- کلام شبلی کے اعلام واشخاص۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۲۰ء
- کلیات شبلی اردو۔مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی،دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء
- گلدستہ ادب۔پنڈت منوہر لال زتشی،انڈین پریس لمٹیڈ الہ آباد،۱۹۳۳ء
- ماتم شبلی۔قاضی عبدالرحمٰن حیرت۔کاظمی پریس جون پور،فروری ۱۹۱۵ء
- متاع رفتگاں۔شاہ معین الدین احمد ندوی،ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء
- متعلقات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،ادبی دائرہ اعظم گڑھ،طبع دوم۔۲۰۱۱ء
- مذہب اور سائنس،مولانا عبدالباری ندوی،مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو،۱۹۹۱ء

- مراسلات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۶ء
- مرقع تاج پوشی (حصہ دوم)۔سید امجد علی اشہری،مطبع آگرہ اخبار،آگرہ
- مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی کا حصہ۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ۔۲۰۲۱ء
- مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۱۹۹۲ء
- مشعل راہ۔ابوالفیض عزم سہریاوی، المرتضی اپارٹمنٹ جامعہ نگر نئی دہلی،۲۰۱۳ء
- مطالعات ومشاہدات۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۰ء
- مغربی تہذیب انحطاط اور علاج۔مولانا حبیب ریحان ندوی، دارالتصنیف والترجمہ بھوپال،طبع اول:۱۹۹۷ء
- مکاتیب شبلی (اول ودوم)۔سید سلیمان ندوی۔دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۰ء،۲۰۱۲ء
- مکتوبات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۲۱ء
  مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں۔عبداللطیف اعظمی،شبلی اکادمی دہلی،
- میری صحافتی زندگی۔احمد سعید ملیح آبادی، انشا پبلی کیشنز کولکاتا،۲۰۱۸ء
- نقوش شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۲۰ء
- نگارشات۔ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی،مجلس علمی نئی دہلی، س،ن
- نوادرات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۷ء
- نوشتے۔ڈاکٹر سلمان عباسی، اردو سماج پبلی کیشن،لکھنو۔۱۹۸۶ء
- ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں،مولانا سید سلیمان ندوی، اکیڈمی آف ایجوکیشن ریسرچ کراچی،طبع ثانی ۱۹۵۸ء
- یادایام۔عبدالرزاق کانپوری، آتش فشاں پبلی کیشن لاہور،۱۹۹۳ء
- یادرفتگاں۔مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۱۹۹۳ء
- یادگار شبلی۔شیخ محمد اکرام، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور،۱۹۹۴ء

- یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ ۲۰۱۴ء

رسائل

- ماہنامہ آج کل، دہلی، جون ۱۹۶۳ء
- ماہنامہ ادیب علی گڑھ: جولائی اگست ۱۹۶۳ء، مدیر: ڈاکٹر ابن فرید
- ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ: مئی ۱۹۸۳ء، مدیر: مولانا مجیب اللہ ندوی
- ماہنامہ خیال وفن لاہور (شبلی نمبر) دسمبر ۲۰۱۵ء، مدیر محمد ممتاز راشد
- روزنامہ زمیندار لاہور، ۳ر دسمبر ۱۹۱۳ء، یکم مارچ ۱۹۱۲ء، مدیر: مولانا ظفر علی خاں
- ماہنامہ ظل السلطان بھوپال: دسمبر ۱۹۱۴ء، مدیر: منشی محمد امین زبیری
- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۴ر اپریل ۱۸۸۶ء
- ماہنامہ معارف اعظم گڑھ: جولائی ۱۹۵۰ء، اکتوبر ۱۹۵۰ء، فروری ۱۹۹۹ء
- ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، (شبلی نمبر) ۲۰۱۵ء، مدیر: پروفیسر اشتیاق احمد ظلی

○○○

اشاریہ

بیان شبلی

(۳)

مرتبہ

مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی

...

اشخاص

○○○

کتب ورسائل

○○○

مقامات

○○○

تعارف مصنف

مرتبہ: شائستہ ریاض

نام : محمد الیاس اعظمی

قلمی نام : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ولدیت : حاجی عبدالرزاق مرحوم

پیدائش : ۲۳ ستمبر ۱۹۶۶ء، بروز جمعہ، صبح ۳۰-۸ بجے

پتہ : موضع مہراج پور، انور گنج، ضلع اعظم گڑھ، ۲۷۶۰۰۱ (یوپی)

رہائش : **شائستہ منزل**، ۱۴۱ ۔ پورہ غلامی عقب آواس وکاس شہر اعظم گڑھ
پن ۲۷۶۰۰۱ [یوپی]

تعلیم : ایم اے ۔ اردو ۔ آگرہ یونیورسٹی آگرہ
پی ایچ ڈی، اردو ۔ پوروانچل یونیورسٹی، جون پور

مشغلہ : پرنسپل: پری ہائر سکنڈری اسکول، اعظم گڑھ

رابطہ : +919838573645

ای میل : azmi408@gmail.com

تصنیفات، تالیفات، کتابیات اور تراجم

۱۔ اسہل التجوید ۔ (فن تجوید) طبع اول: مکتبہ نعیمیہ مئو، ۱۹۸۶ء
طبع دوم: ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۰۴ء
طبع سوم: ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۷ء

۲۔ علم الترتیل ۔ (فن قرات) دانش بک ڈپو ٹانڈہ، ۱۹۹۶ء

۳۔ تذکرۃ القراء (تذکرہ) دانش بک ڈپو ٹانڈہ، ۱۹۹۶ء
طبع دوم: ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۴۔ اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر (تدوین) دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء

۵۔ علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ (تاریخ) طبع اول: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری

پٹنہ،۲۰۰۱ء طبع دوم: ادبی دائرہ،اعظم گڑھ۔جون۲۰۱۴ء

۶۔ دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات۔(تحقیق) خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ،۲۰۰۲ء

۷۔ اشاریہ ماہنامہ الرشاد۔ندوۃ التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ،۲۰۰۴ء

۸۔ موازنہ انیس ودبیر(تدوین) دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۰۴ء

۹۔ عظمت کے نشاں۔(شخصیات) ادب کدہ،مہراج پور اعظم گڑھ،۲۰۰۵ء

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو انعام۔۲۰۰۵ء

طبع دوم: ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۰ء

۱۰۔ ساحلوں کے شہر میں (سفرنامہ) طبع اول: ادب کدہ،مہراج پور اعظم گڑھ،۲۰۰۶ء

طبع دوم: ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۹ء

۱۱۔ شاہ معین الدین احمد ندوی حیات وخدمات (سوانح) ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۰۷ء

۱۲۔ متعلقات شبلی۔(شبلیات) ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۰۸ء

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو انعام۔۲۰۰۸ء

طبع دوم: ادبی دائرہ اعظم گڑھ،فروری ۲۰۱۱ء

۱۳۔ کاروان رفتگاں،مولانا مجیب اللہ ندوی (تدوین) ندوۃ التالیف والترجمہ اعظم گڑھ،۲۰۰۸ء

۱۴۔ رحمت عالم ہندی (ترجمہ) دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۰۹ء

طبع دوم: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء

طبع سوم: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۱۷ء

طبع چہارم: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۲۰ء

۱۵۔ نیور بی اے ہندو۔اردو (ترجمہ) اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی،۲۰۱۰ء

طبع دوم: اسلامک بک فاؤنڈیشن دہلی،۲۰۱۷ء

۱۶۔ مطالعات ومشاہدات۔(شخصیات) ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۰ء

۱۷۔ کتابیات شبلی۔(کتابیات) دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ،۲۰۱۱ء

۱۸۔ تاریخ اعظم گڑھ۔شاہ افضال اللہ (تدوین) ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۱ء

۱۹۔ شبلی سخنوروں کی نظر میں۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۲ء
اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو انعام یافتہ۔۲۰۱۲ء
۲۰۔ مکتوبات شبلی۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۲ء
۲۱۔ کتابیں حصہ اول۔(تبصرے)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۲ء
۲۲۔ کتابیں حصہ دوم۔(تبصرے)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء
۲۳۔ آثار شبلی۔(شبلیات) دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء
۲۴۔ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط۔(شبلیات)ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء
۲۵۔ یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی۔(سوانح)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء
۲۶۔ عکس واثر۔(تحقیق وتنقید)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء
۲۷۔ شبلی شناسی کے سو سال۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء
۱۔بہار اردو اکادمی پٹنہ کا اول انعام۔سند نمبر ۲۰۱۴ء/۱۰
۲۔اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو انعام۔۲۰۱۴ء
۲۸۔ کتابیات مجیب۔(کتابیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء
۲۹۔ شذرات شبلی۔(شبلیات)دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء
۳۰۔ اقبال اور دبستان شبلی۔(تحقیق وتنقید)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء
۳۱۔ قرائے عظام اوران کی علمی ودینی خدمات(تذکرہ)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء
۳۲۔ شبلی اور جہان شبلی۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۵ء
۳۳۔ مراسلات شبلی۔(شبلیات)دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ،۲۰۱۶ء
۳۴۔ کلیات نشور واحدی حصہ غزلیات(ترتیب)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۶ء
۳۵۔ محبت نامے۔(مشاہیر کے خطوط بنام ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۷ء
۳۶۔ نوادرات شبلی۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۷ء
جان گل کرسٹ ایوارڈ۔مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا۔
۳۷۔ شبلی خود نوشتوں میں۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۸ء

۳۸۔ قد اور سائے ۔(تحقیق وتنقید)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۱۹ء

۳۹۔ علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں(شبلیات)دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۱۹ء

۴۰۔ نقوش شبلی ۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۲۰ء

۴۱۔ کلام شبلی کے اعلام واشخاص ۔(شبلیات)ادبی دائرہ،اعظم گڑھ،۲۰۲۰ء

۴۲۔ بیان شبلی جلد اول(شبلیات)ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۲۱ء

۴۳۔ بیان شبلی جلد دوم(شبلیات)ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۲۲ء

۴۴۔ افادات شبلی ۔(شبلیات)ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی،۲۰۲۲ء

۴۵۔ شبلی اقتباسات کی روشنی میں ۔ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۲۲ء

۴۶۔ علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو ۔مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتا،۲۰۲۱ء

۴۷۔ اثرات شبلی (اول ودوم)ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۲۲ء

رکن مجلس ادارت ومشاورت :

۱۔ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ ۲۔ماہنامہ آموزگار،جل گاؤں

۳۔سہ ماہی مجلّہ فکر ونظر اسلام آباد ۴۔سہ ماہی مجلّہ جہات الاسلام لاہور

۵۔ادبی گزٹ مئو ۶۔سہ ماہی تخلیق وتحقیق،مئو

۷۔سہ ماہی رشد وہدایت ۔مبارک پور ۸۔ماہنامہ الماس ۔ممبئی

اعزاز ، انعام ، ایوارڈ :

۱۔رفیق اعزازی:دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ،۲۰۰۹ء

۲۔افتخار شبلی ایوارڈ:شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ،حیدرآباد،۲۰۱۶ء

۳۔امتیاز شبلی ایوارڈ:شعبہ اردو شبلی نیشنل پی جی کالج،اعظم گڑھ،۲۰۱۷ء

۴۔جان گل کرسٹ ایوارڈ ۲۰۱۷ء:مغربی بنگال اردو،اکادمی،کولکاتا

۵۔مسعود حسن رضوی انعام برائے تحقیق ۲۰۱۸ء:اترپردیش اردو اکادمی،لکھنو

۶۔سند توصیف:بزم حفیظ جون پوری شیراز ہند جون پور،۲۰۱۹ء

BAYAN-E-SHIBLI-3

by

Dr. Mohammad Ilyas Azmi

بات شبلی کے نصیب کی تھی جس نے پوری صدی کو شبلی کی عمل داری میں لادیا، لیکن شبلی کا فیضان رکھنے والا کہاں تھا، صدی کے ختم ہوتے ہوتے، شبلی کی ملت میں ایک مجدد نے ظہور کیا، جس نے اپنے لیے صرف ایک جزیرہ کا انتخاب کیا۔ ایسا جزیرہ جو شبلی کا تنہا اور کامل، جلوہ گاہ ثابت ہو۔ دیکھتے دیکھتے اس جزیرۂ شبلی سے حیات شبلی کے سمندر کی ہر موج ٹکرانے لگی، نتیجے میں اس بحر کی تہہ سے خدا جانے کتنے ہیرے موتی اچھل کر جزیرے کو بیش بہا خزانے میں بدلنے لگے۔

جب الیاس صاحب کے قلم سے شروع میں شبلی پر چھوٹے چھوٹے مضامین آئے تو ان کے احباب اور ہم نشینوں کا کیا ذکر خود الیاس صاحب کے عالم خیال میں بھی یہ لمحہ نہیں گزرا ہوگا کہ یہ نوزائیدہ قلم ایک دن پچاسوں ضخیم اور وقیع کتابوں کے حق ملکیت کا تنہا دعویدار ہوگا۔ ان کی کتابوں پر کتابیں آتی رہیں، مضامین نو کے انبار لگتے رہے اور نگاہیں خیرہ ہوتی رہیں کہ شبلی کی جہاں گیری کی تمام وسعتوں اور مدفون خزینوں کی یافت اور حصول کی یہ کون سی کنجی، ان کے ہاتھ لگی۔ کوئی تو گوشہ چھوٹتا، جہاں شبلی کو ان کی آہٹ محسوس نہ ہوتی۔ اب یہ شبلی کا فیضان ہے یا الیاس صاحب پر شبلی کے خالق کا احسان کہ جو کام کئی انجمنوں اور پچاسوں محققوں کے بس کا نہ تھا وہ شبلی کے ایک گوشہ نشیں نام لیوا سے لے لیا گیا۔ سلام علی الیاسین۔

(مولانا) عمیر الصدیق ندوی

ISBN 978-93-94616-23-3

978-93-94616-23-3

www.ephbooks.com

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA